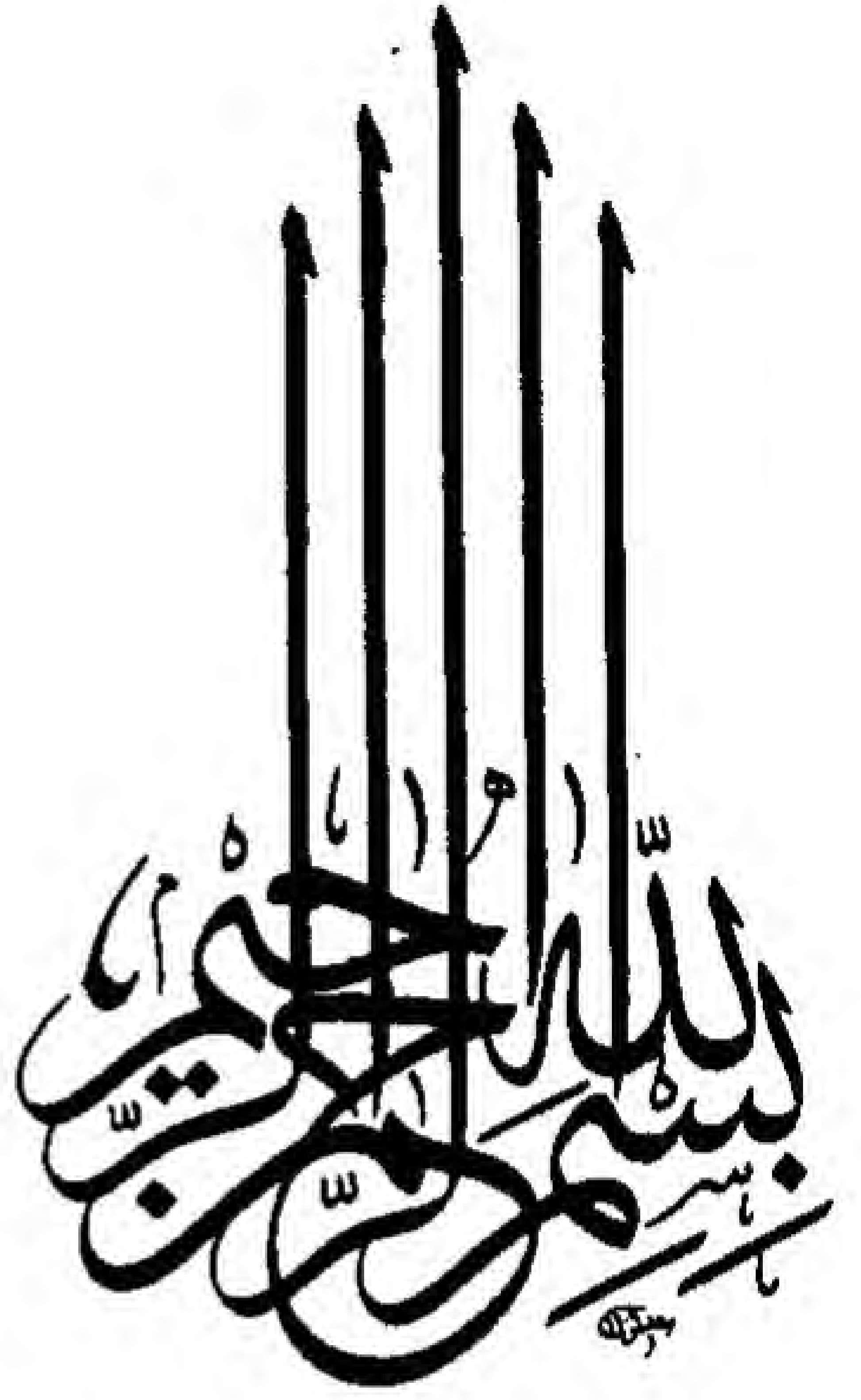
انتخاب

مجید امجد



مرتبہ

سعد اللہ شاہ



انتخاب مجید امجد

ملنے کے پتے

مکتبہ رحمانیہ، اقرا سنٹر، اردو بازار لاہور
سعد پبلیکیشنز، فرسٹ فلور، میاں مارکیٹ، اردو بازار، لاہور
میاں ندیم، مین بازار، جہلم
کشمیر بک ڈپو، تلہ گنگ روڈ، چکوال
بنگش بک ڈپو اردو بازار، سیالکوٹ
مسلم بک لینڈ، بینک روڈ، مظفر آباد
کوالٹی ڈیپارٹمنٹل سٹور، کالج روڈ، بورے والا
ضیاء القرآن پبلشرز، اردو بازار، کراچی
ویلکم بک پورٹ، اردو بازار، کراچی
دہاڑی کتاب گھر- مین بازار، وہاڑی
یونیورسٹی بک ایجنسی، خیبر بازار، پشاور
رحمان بک ہاؤس، اردو بازار، کراچی
بک سنٹر، علامہ اقبال چوک، سیالکوٹ
الکریم نیوز ایجنسی گول چوک، اوکاڑہ
منیر برادرز، مین بازار، جہلم

اسلامی کتب خانہ، فضل الٰہی مارکیٹ، اردو بازار، لاہور
مکتبہ العلم، ۱۷- اردو بازار لاہور
چوہدری بک ڈپو، مین بازار، دینہ
مکتبہ رشیدیہ، نیو جنرل، چکوال
اسلامک بک سنٹر، اردو بازار، کراچی
دارالادب تلمبہ روڈ، میاں چنوں
ضیاء القرآن پبلشرز، گنج بخش روڈ، لاہور
اشرف بک ایجنسی، کمیٹی چوک، راولپنڈی
فرید پبلشرز، نزد مقدس مسجد، اردو بازار، کراچی
شمع بک ایجنسی، فیصل آباد
کتاب گھر، علامہ اقبال روڈ، راولپنڈی
ہاشمی برادرز، مشن چوک، کوئٹہ
الیاس کتاب محل کچہری بازار، جڑانوالہ
ڈائمنڈ بک ڈپو، بینک روڈ، مظفر آباد آزاد کشمیر

انتخاب مجید امجدؒ

مرتب

سعد اللہ شاہ

خزینۂ علم و ادب

الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور ۷۲۳۱۶۹



سال اشاعت ۲۰۰۱ء

سرورق عبیداللہ

اہتمام محمد نذیر' طاہر نذیر

کمپوزنگ الاشراق کمپوزنگ سنٹر' لاہور

مطبع زاہد بشیر پرنٹرز' لاہور

قیمت 130/- روپے

فہرست

مجید امجد

(سوانحی خاکہ)

دورِ حاضر کے انتہائی منفرد اور اہم شاعر عبدالمجید امجد ۲۹ جون ۱۹۱۴ء کو جھنگ صدر میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق ایک غریب اور شریف گھرانے سے تھا۔ ابھی دو برس کے تھے کہ ان کے والد اور والدہ میں علیحدگی ہو گئی اور والدہ انہیں لے کر اپنے میکے آ گئیں۔ مجید امجد نے ابتدائی تعلیم اپنے نانا سے حاصل کی جن کا شمار جھنگ کے اہل علم واہل صفا میں ہوتا تھا۔ پہلے امجد نے چند برس تک ایک مسجد میں فارسی، عربی اور طب وغیرہ کا مطالعہ کیا۔ پھر پہلی جماعت میں داخل ہوئے۔ ۱۹۳۰ء میں اسلامیہ ہائی سکول جھنگ صدر سے میٹرک کا امتحان فسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ دو سال بعد گورنمنٹ کالج جھنگ سے فسٹ ڈویژن میں انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں کامیاب ہوئے۔ چونکہ ان دنوں جھنگ میں مزید تعلیم کا حصول ممکن نہیں تھا اس لیے اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور میں داخل ہوئے اور وہیں سے ۱۹۳۴ء میں بی اے کی ڈگری حاصل کی۔

ان دنوں دنیا عظیم اقتصادی دباؤ کا شکار تھی۔ ملازمتیں عنقا تھیں۔ انتہائی اعلیٰ ڈگریاں رکھنے والے لوگ بھی حصول ملازمت میں سرگرداں تھے۔ ان حالات میں مجید امجد بی اے کر کے جھنگ واپس لوٹے تو وہاں کے ایک ہفت روزہ اخبار ''عروج'' کے ساتھ وابستہ ہو گئے۔ ۱۹۳۹ء تک وہ عروج کے مدیر رہے۔ اس عرصے میں ان کی نظم و نثر عروج میں برابر شائع ہوتی رہی۔ دوسری عالمی جنگ کے آغاز کے دنوں میں برطانوی سامراج کے خلاف ان کی نظم ''قیصریت'' ان کی غیر حاضری میں کاتب نے عروج کے صفحہ اول پر شائع کر دی جس کی پاداش میں عروج چھوڑنا پڑا اور وہ ڈسٹرکٹ بورڈ جھنگ میں کلرک ہو گئے۔ ۱۹۴۴ء میں وہ یہاں ہیڈ کلرک تھے کہ سول سپلائز ڈیپارٹمنٹ کا قیام عمل میں آیا۔ اشیا کی قلت کی وجہ سے ان دنوں اشیائے خوردنی، ایندھن اور کپڑا راشن پر ملا کرتا تھا اور راشننگ کا کام اسی محکمے کے سپرد تھا۔ مجید امجد نے لاہور آ کر ٹیسٹ دیا۔ منتخب ہوئے اور انسپکٹر سول سپلائز مقرر ہو گئے۔ چند برسوں کے بعد ترقی پا کر اسسٹنٹ فوڈ کنٹرولر بن گئے۔ اس محکمے کی ملازمت کے دوران انہوں نے بے شمار چھوٹے بڑے شہروں اور قصبوں میں کام کیا۔ لائل پور (فیصل آباد) گوجرہ، سمندری، تاندلیانوالہ، جڑانوالہ، چیچہ وطنی، مظفر گڑھ، لیہ، پاک پتن، اوکاڑہ، عارف والہ، راولپنڈی، لاہور (شاہدرہ) وغیرہ میں بسلسلہ ملازمت مختصر وقفوں میں قیام رہا مگر ملازمت کا زیادہ عرصہ منٹگمری (موجودہ ساہیوال) میں بسر ہوا۔ جہاں سے وہ ۲۹ جون ۱۹۷۲ء کو ریٹائر ہوئے۔

مجید امجد کی شادی ۱۹۳۹ء میں خالہ کی بیٹی سے ہوئی تھی جو گورنمنٹ سکول جھنگ میں پرائمری کی مدرس تھی لیکن مزاج کے اختلاف کی وجہ سے وہ جھنگ میں ملازمت کرتی تھی اور مجید امجد جھنگ سے باہر ملازمت پر رہتے تھے۔ وہ اولاد سے محروم تھے۔

امجد نہایت وسیع المطالعہ شخص تھے- فارسی اور انگریزی زبانوں پر عبور رکھتے تھے- عربی' ہندی اور پنجابی سے بھی اچھی طرح واقف تھے- انگریزی زبان کے توسط سے مختلف معاشرتی اور سائنسی علوم کا مطالعہ آخری عمر تک کرتے رہے- وہ کم گو اور تنہائی پسند تھے- حقیقی معنوں میں ان کا کوئی دوست نہیں تھا- وہ ملنے جلنے والوں کے آگے اپنا دل کبھی نہیں کھولتے تھے-

ان کی آخری عمر انتہائی عسرت میں بسر ہوئی- خصوصاً ریٹائرمنٹ کے بعد سے وفات کے ایک ماہ پہلے تک انہیں پنشن نہ مل سکی- نوبت تقریباً فاقہ کشی تک پہنچ گئی- مختلف امراض عود کر آئے مگر وہ اتنے خوددار تھے کہ کسی دوست کو اپنا حال زار بتانے سے مکمل اجتناب کرتے تھے- آخر اسی کیفیت میں ۱۱ مئی ۱۹۷۴ء کے روز اپنے کوارٹر واقع فرید ٹاؤن ساہیوال میں مردہ پائے گئے- تدفین آبائی وطن جھنگ میں ہوئی-

مجید امجد نہ تو خوش شکل تھے اور نہ ہی خوش گفتار' انتہائی لمبا قد' جسم بے حد دبلا پتلا' بینائی جوانی ہی میں کمزور ہو گئی تھی- موٹے موٹے شیشوں کی عینک لگاتے تھے- رات کو انہیں بہت کم دکھائی دیتا تھا- ان کے گھرانے میں تپ دق کا موذی مرض بھی موجود تھا- امجد کے اپنے پھیپھڑے بھی متاثر تھے- لیکن اس بیمار اور غیر دلکش ظاہر کے حامل شخص کا باطن انتہائی خوبصورت تھا- ان کی زبان سے کبھی فحش یا حسد آمیز جملہ صادر نہیں ہوا بلکہ عموماً خاموش ہی رہتے تھے- چھوٹے بڑے ہر شخص کو عزت سے بلاتے تھے- تنگ دستی میں بھی غرباء کی مالی مدد کرتے تھے- خود کبھی کسی پر بار نہیں بنے- انہیں ادبی حلقوں نے مسلسل نظر انداز کیا لیکن انہوں نے کبھی ردعمل ظاہر نہیں کیا-

مجید امجد کا کلام تعداد اور معیار دونوں اعتبار سے دور حاضر کے اہم شاعروں سے بڑھ کر ہے- جتنا تنوع ان کے ہاں پایا جاتا ہے وہ اردو کے کسی جدید شاعر میں موجود نہیں- ان کی تقریباً ہر نظم مختلف موضوع اور مختلف ہیئت میں تخلیق ہوئی ہے- ان کے کلام میں زبردست آورد پائی جاتی ہے- اس کے باوجود جذباتی گہرائی جتنی ان کے ہاں ملتی ہے وہ عصر حاضر میں کسی اور کے ہاں نایاب ہے- وہ بیک وقت شاعری کے مختلف اور متضاد رجحانات کو اپنے دل و دماغ کی بھٹی میں پگھلا کر اور پھر ان سے نئے سانچے تخلیق کر کے ہر باذوق قاری کو متحیر کر دینے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں-

ان کے انتقال پر کسریٰ منہاس نے ذیل کا قطعہ تاریخ وفات کہا:

موت برحق ہے مگر اک جوہر قابل کی موت — وائے بر محفل جدا ہم سے مجید امجد ہوئے
کیسے کیسے دوست کسریٰ چل دیئے منہ پھیر کر — دوستی کے جتنے دعوے تھے وہ سارے زد ہوئے
عجز و ایثار و خلوص و بے ریائی کے قصور — ایک شخص ایسا تھا جس سے عمر بھر سرزد ہوئے
جس کے فن میں وقت کی لے دل کی دھڑکن بن گئی — اس کے گیتوں میں ڈھلے جتنے بھی جزر و مد ہوئے

عیسوی میں فرد نکلا مصرع سال وفات
'داخل باغ جناں عبدالمجید امجد ہوئے'

(کلیات مجید امجد از: ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا سے)

آہ یہ خوش گوار نظارے!

(۱)

سامنے کیا ہے اک پہاڑی ہے — خوب صورت' بلند اور شاداب
اس کی چیں بر جبیں چٹانوں پر — رقص کرتے ہیں سایہ ہائے سحاب
اس کی خاموش وادیاں' یعنی — ایک سویا ہوا جہانِ شباب
اس کی سقفِ بلند کے آگے — آسماں ایک' سرنگوں محراب
شام کے وقت کوہ کا منظر — جیسے بھولا ہوا طلسمی خواب
جھومتے' ناچتے ہوئے چشمے — پھوٹتا' پھیلتا ہوا سیماب
دُوب کی رینگتی ہوئی بیلیں — پتھروں سے پٹے ہوئے تالاب

آہ یہ خوش گوار نظارے
خلد کے شاہکار نظارے

(۲)

چیل کے اف یہ بے شمار درخت　　اور یہ ان کی عنبریں بو باس
سنبلیں کونپلوں سے چھنتے ہوئے　　یہ نسیمِ شمال کے انفاس
سایہ ہائے دراز کے نیچے　　سرنگوں جھاڑیوں کا خوف و ہراس
چیل کی چوٹیوں پہ صبح کے وقت　　سبز پتوں کا زرنگار لباس
یہ دھواں جھونپڑوں سے اٹھتا ہوا　　کوہ کے اس طرف افق کے پاس
یہ برستی ہوئی گھٹا کا سماں　　قلبِ شاعر پہ بارشِ احساس
آہ یہ خوش گوار نظارے
خلد کے شاہکار نظارے

(۳)

مرغزاروں میں تا بحدِ نظر　　لطف افزا فضا مہکتی ہوئی
شب کو دہقاں کے تنگ جھونپڑے سے　　سرخ سی روشنی جھلکتی ہوئی
ابر میں کوندتی ہوئی بجلی　　دامنِ آتشیں جھٹکتی ہوئی
کوہ کی سر بلند چوٹی سے　　اک نئی تازگی ٹپکتی ہوئی
آہ یہ خوش گوار نظارے
خلد کے شاہکار نظارے

(۴)

وادیوں کا ہر ایک خارِ حقیر　　امتدادِ زمانہ کی تصویر
قدسیوں کی ادائے کج نگہی　　صبح کے آفتاب کی تنویر
جلوہ ہائے شفق کی عریانی　　ایک رنگین خواب کی تعبیر
زمہریری ہوا کے جھونکوں سے　　ڈبڈبائی ہوئی سی چشمِ اثیر
آہ یہ خوش گوار نظارے
خلد کے شاہکار نظارے

(۵)

چاہتا ہوں کہ اپنی ہستی کو　　سرمدی کیف میں ڈبو جاؤں
چاہتا ہوں کہ ان فضاؤں کی　　وسعتِ بیکراں میں کھو جاؤں
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں میں　　جذب ہو جاؤں جذب ہو جاؤں
آہ یہ خوش گوار نظارے
خلد کے شاہکار نظارے

محبوبِ خداؐ سے

نو بہارِ گلستانِ معرفت — یعنی اے روح و روانِ معرفت
تیرے دل میں جلوۂ ربِ جمیل — تیری محفل میں سرودِ جبرئیل
اہتمامِ اہتزازِ کائنات — تیری اک ادنیٰ نگاہِ التفات
قرب یابِ درگہِ یزداں ہے تو — ساقیٔ خم خانۂ عرفان ہے تو
جھک رہا ہے تیرے در پر آسماں — چومتا ہے تیرے قدموں کو جہاں
تیرے دم سے دل کی کلیاں کھل گئیں — بد نصیبوں کو مرادیں مل گئیں
تیری چوکھٹ پر جھکی جس کی جبیں — ہو گیا اس کے جہاں زیرِ نگیں
میں سمجھتا ہوں کہ تیری خاکِ پا — کیمیا ہے کیمیا ہے کیمیا
مجھ پہ گر تو لطف فرمائی کرے — بخت میرا نازِ دارائی کرے
میں بھی ہوں اک بندۂ عصیاں شعار — کشتۂ جور و جفائے روزگار
میں بھی تیرا بستۂ فتراک ہوں — کس قدر غمگین ہوں غمناک ہوں
میں زمانے بھر سے ٹھکرایا گیا — میں ہر اک محفل سے اٹھوایا گیا
درگہِ عالم سے دھتکارا ہوا — بخت اور تقدیر کا مارا ہوا
اب ترے دربار میں آیا ہوں میں — دل میں لاکھوں حسرتیں لایا ہوں میں
تجھ کو میری بے کسی کا واسطہ — اپنی شانِ خسروی کا واسطہ

مر رہا ہوں زندگی کا جام دے رحمتِ جاوید کا پیغام دے
اب زمانے میں مرا کوئی نہیں آسرا تیرے سوا کوئی نہیں
اک فقط درد آشنا تو ہی تو ہے میرے دل کا مدعا تو ہی تو ہے
جب ترے دربار میں آتا ہوں میں جب تری سرکار میں آتا ہوں میں
عظمتِ مفقود کو پاتا ہوں میں منزلِ مقصود کو پاتا ہوں میں
تیرے آگے ہاتھ پھیلاتا ہوں میں جھولیاں بھر بھر کے لیجاتا ہوں میں
زندگی کی زندگی تو ہی تو ہے روح کی تابندگی تو ہی تو ہے

میرے دل کو مہبطِ انوار کر
مجھ کو بھی بینندۂ اسرار کر

حُسن

یہ کائنات مرا اک تبسمِ رنگیں
بہارِ خلد مری اک نگاہِ فردوسیں
ہیں جلوہ خیز زمین و زماں مرے دم سے
ہے نور ریز فضائے جہاں مرے دم سے
گھٹا؟ نہیں یہ مرے گیسوؤں کا پرتو ہے!
ہوا؟ نہیں مرے جذبات کی تگ و دو ہے!
جمالِ گل؟ نہیں بے وجہ ہنس پڑا ہوں میں
نسیمِ صبح؟ نہیں سانس لے رہا ہوں میں
یہ عشق تو ہے اک احساسِ بیخودانہ مرا
یہ زندگی تو ہے اک جذبِ والہانہ مرا
ظہور کون و مکاں کا سبب! فقط میں ہوں
نظامِ سلسلۂ روز و شب! فقط میں ہوں

غزل

عشق کی ٹیسیں جو مضراب رگِ جاں ہو گئیں
روح کی مدہوش بیداری کا ساماں ہو گئیں

پیار کی میٹھی نظر سے تو نے جب دیکھا مجھے
تلخیاں سب زندگی کی لطف ساماں ہو گئیں

اس لبِ رنگیں پہ نوریں مسکراہٹ؟ کیا کہوں
بجلیاں گویا شفق زاروں میں رقصاں ہو گئیں

ماجرائے شوق کی بے باکیاں ان پر نثار
ہائے وہ آنکھیں جو ضبطِ غم میں گریاں ہو گئیں

چھا گئیں دشواریوں پر میری سہل انگاریاں
مشکلوں کا اک خیال آیا کہ آساں ہو گئیں

نو وارد

نازنیں! اجنبیٔ شہرِ محبت ہوں میں
میں ترے دیس کے اطوار سے ناواقف ہوں
دیدۂ شوق کی بیباک نگاہی پہ نہ جا
کیا کروں جرأتِ گفتار سے ناواقف ہوں
چل پڑا ہوں ترے دامن کو پکڑ کر لیکن
اس کٹھن جادۂ پرخار سے ناواقف ہوں
مست ہوں عشرتِ آغاز کی سرمستی میں
میں ابھی عاقبتِ کار سے ناواقف ہوں
سونگھنی ہے تری زلفوں سے ابھی بوئے جنوں
ابھی دامن کے پھٹے تار سے ناواقف ہوں
دل میں یہ جذبۂ بیدار ہے کیا' تو ہی بتا
میں تو اس جذبۂ بیدار سے ناواقف ہوں
اک مسافر ہوں ترے دیس میں آ نکلا ہوں
اور ترے دیس کے اطوار سے ناواقف ہوں

یہی دنیا۔۔۔؟

عشق پیتا ہے جہاں خونابۂ دل کے ایاغ
آنسوؤں کے تیل سے جلتا ہے الفت کا چراغ
جس جگہ روٹی کے ٹکڑے کو ترستے ہیں مدام
سیم و زر کے دیوتاؤں کے سیہ قسمت غلام
جس جگہ حبِ وطن کے جذبے سے ہو کر تپاں
سولی کی رسی کو ہنس کر چومتے ہیں نوجواں
جس جگہ انسان ہے وہ پیکرِ بے عقل و ہوش
نوچ کر کھاتے ہیں جس کی بوٹیاں مذہب فروش
جس جگہ یوں جمع ہیں تہذیب کے پروردگار
جس طرح سڑتے ہوئے مردار پر مردار خوار

جس جگہ اٹھتی ہے یوں مزدور کے دل سے فغاں
فیکٹری کی چمنیوں سے جس طرح نکلے دھواں
جس جگہ سرما کی ٹھنڈی شب میں ٹھٹھرے ہونٹ سے
چومتی ہے رو کے بیوہ گال سوتے لال کے
جس جگہ دہقاں کو رنجِ محنت و کوشش ملے
اور نوابوں کے کتوں کو حسیں پوشش ملے
تیرے شاعر کو یقیں آتا نہیں، ربّ العلا!
جس پہ تو نازاں ہے اتنا، وہ یہی دنیا ہے کیا؟

نفیرِ عمل

آہ کب تک گلۂ شومئ تقدیر کریں
کب تلک ماتمِ ناکامئ تدبیر کریں
کب تلک شیونِ جورِ فلکِ پیر کریں
کب تلک شکوۂ بے مہرئ ایام کریں
نوجوانانِ وطن! آؤ کوئی کام کریں

آج بربادِ خزاں ہے چمنستانِ وطن
آج محرومِ تجلی ہے شبستانِ وطن
مرکزِ نالہ و شیون ہے دبستانِ وطن
وقت ہے چارۂ دردِ دلِ ناکام کریں
نوجوانانِ وطن! آؤ کوئی کام کریں

آؤ اجڑی ہوئی بستی کو پھر آباد کریں
آؤ جکڑی ہوئی روحوں کو پھر آزاد کریں
آؤ کچھ پیروئ مسلکِ فرہاد کریں
یہ نہیں، شرطِ وفا بیٹھ کے آرام کریں
نوجوانانِ وطن! آؤ کوئی کام کریں

ایک ہنگامہ سا ہے آج جہاں میں برپا
آج بھائی ہے سگے بھائی کے خوں کا پیاسا
آج ڈھونڈے سے نہیں ملتی زمانے میں وفا
آؤ اس جنسِ گرانمایہ کو پھر عام کریں
نوجوانانِ وطن! آؤ کوئی کام کریں

جاہِ جم سے نہ ڈریں شوکتِ کَے سے نہ ڈریں
حشمتِ روم سے اور صولتِ رے سے نہ ڈریں
ہم جواں ہیں تو یہاں کی کسی شے سے نہ ڈریں
ہم جواں ہیں تو نہ کچھ خدشۂ آلام کریں
نوجوانانِ وطن! آؤ کوئی کام کریں

رشتۂ مکر و ریا توڑ بھی دیں، توڑ بھی دیں
کاسۂ حرص و ہوا پھوڑ بھی دیں، پھوڑ بھی دیں
اپنی یہ طرفہ ادا چھوڑ بھی دیں، چھوڑ بھی دیں
آؤ کچھ کام کریں، کام کریں، کام کریں
نوجوانانِ وطن! آؤ کوئی کام کریں

شاعر

میں شاعر ہوں میری جمالیں نگہ میں
ذرا بھی نہیں فرق ذرے میں مہ میں
جہاں ایک تنکا سا ہے میری رہ میں

ہر اک چیز میرے لیے ہے فسانہ
ہر اک دوب سے سن رہا ہوں ترانہ
مرے فکر کے دام میں ہے زمانہ

میں سینے میں داغوں کے دیپک جلائے
میں اشکوں کے تاروں کا بربط اٹھائے
خیالوں میں نغموں کی دنیا بسائے

رہِ زیست پر بے خطر جا رہا ہوں
کہاں جا رہا ہوں، کدھر جا رہا ہوں
نہیں جانتا ہوں، مگر جا رہا ہوں

یہ دنیا یہ بے ربط سی ایک زنجیر
یہ دنیا یہ اک نامکمل سی تصویر
یہ دنیا نہیں میرے خوابوں کی تعبیر

میں جب سوچتا ہوں کہ انساں کا انجام
ہے مٹی کے اک گھر کی آغوشِ آرام
تو سینے میں اٹھتا ہے اک دردِ بے نام

میں جب دیکھتا ہوں کہ یہ بزمِ فانی
غمِ جاودانی کی ہے اک کہانی
تو چیخ اٹھتی ہے میری باغی جوانی

یہ محلوں، یہ تختوں، یہ تاجوں کی دنیا
گناہوں میں لتھڑے رواجوں کی دنیا
محبت کے دشمن سماجوں کی دنیا

یہاں پر کلی دل کی کھلتی نہیں ہے
کوئی چق دریچوں کی ہلتی نہیں ہے
مرے عشق کو بھیک ملتی نہیں ہے

اگر میں خدا اس زمانے کا ہوتا
تو عنوان اور اس فسانے کا ہوتا
عجب لطف دنیا میں آنے کا ہوتا

مگر ہائے ظالم زمانے کی رسمیں
ہیں کڑواہٹیں جن کی امرت کے رس میں
نہیں میرے بس میں نہیں میرے بس میں

مری عمر بیتی چلی جا رہی ہے
دو گھڑیوں کی چھاؤں ڈھلی جا رہی ہے
ذرا سی یہ بتی جلی جا رہی ہے

جونہی چاہتی ہے مری روح، مدہوش
کہ لائے ذرا لب پہ فریاد پرجوش
اجل آ کے کہتی ہے خاموش! خاموش!

ریل کا سفر

کراچی کو جاتی ہوئی ڈاک گاڑی
دھوئیں کے سمندر میں تیر اک گاڑی
مسافت کو یوں طے کیے جا رہی ہے
سفر کو غٹا غٹ پیے جا رہی ہے
یہ چٹیل سے میداں یہ ریتوں کے ٹیلے
ہیں جن پر بچھے دوب کے زرد تیلے
یہ کپاس کی کھیتیوں کی بہاریں
یہ ڈوڈوں کو چنتی ہوئی گلعذاریں
گھنے بن کی پھلواڑیوں کی تگ و دو
اور ان پر بگولوں کی زلفوں کے پرتو
یہ چھوٹی سی بستی، یہ ہل اور یہ ہالی
یہ صحرا میں آوارہ، بھیڑوں کے پالی
یہ حیران بچے یہ خاموش مائیں
یہ گوبر کی چھینٹوں سے لتھڑی قبائیں
یہ نہروں میں بہتا ہوا مست پانی
یہ گنوں کی رت کی سنہری جوانی
یہ اینٹوں کا آوا، یہ اونٹوں کی ڈاریں
یہ کیکر کے پیڑوں کی لمبی قطاریں
درختوں کے سایوں سے آباد رستے
یہ آزاد راہی، یہ آزاد رستے
بدلتے چلے جا رہے ہیں نظارے
نئے سے نئے آ رہے ہیں نظارے
یہ صحرا جو نظروں کو برما رہا ہے
مرے ساتھ بھاگا چلا آ رہا ہے
نظر ایک منظر پہ جمتی نہیں ہے
یہ موج آ کے ساحل پہ تھمتی نہیں ہے

کنواں بن میں برباد سا اک پڑا ہے　　کسی یادِ رنگیں میں ڈوبا ہوا ہے
بہت دور ادھر ایک محمل رواں ہے　　دلہن کوئی میکے کو شاید رواں ہے
کھجوروں کا جھرمٹ نظر آ رہا ہے　　پتا رودِ راوی کا بتلا رہا ہے
وہ گاڑی کے پہیوں کی دلدوز آہٹ　　وہ اڑتے ہوئے بگلوں کی پھڑپھڑاہٹ
یہ شامِ دلآرا یہ پل کا نظارہ　　نگاہوں سے چھپتا ہوا وہ کنارا
وہ اٹھتا ہوا مرتعش ناتواں سا　　بہت دور اک جھونپڑے سے دھواں سا
وہ ویراں سی مسجد، وہ ٹوٹی سی قبریں　　وہ تارا شفق کے گلابی دھوئیں میں
نیا رنگ ہر دم دکھاتے ہیں منظر　　نہیں ختم ہونے میں آتے ہیں منظر
ہر اک شے میں حرکت ہے جولانیاں ہیں　　ہر اک ذرے میں وجد سامانیاں ہیں
کشش ہے فسوں ہے نہ جانے وہ کیا ہے　　جو گاڑی کو کھینچے لیے جا رہا ہے

مرا خطۂ نور و رنگ آ گیا ہے
مرا سکھ بھرا دیس جھنگ آ گیا ہے

قیصریت

(۱)

ایک قطرہ سلطنت کی موج کا
اک سپاہی بادشہ کی فوج کا!
دوش پر تیر و کماں باندھے ہوئے
جا رہا تھا رختِ جاں باندھے ہوئے
چوم کر اس کے گلابی گال کو
جاتے دم کہتا تھا اپنے لال کو
''دیکھتی ہے راستہ امی تری
جاؤ بیٹا! جاؤ! میں آیا ابھی''
بچہ مڑ کر چل پڑا ماں کی طرف
اور سپاہی خونی میداں کی طرف

(۲)

وہ سپاہی جنگ میں مارا گیا
ڈوب اس کی زیست کا تارا گیا
لاش اس کی جوئے خوں میں بہہ گئی
کشتوں کے پشتوں میں کھو کر رہ گئی

لٹ گیا جب اس کی دلہن کا سہاگ	تھام لی شیطاں نے اسکے دل کی باگ
اس نے کر لی ایک اور شادی کہیں	حسن اور خوئے وفا؟ ممکن نہیں!

(۳)

اس سپاہی کا وہ اکلوتا یتیم	آنکھ گریاں، روح لرزاں، دل دو نیم
بادشہ کے محل کی چوکھٹ کے پاس	لے کے آیا بھیک کے ٹکڑے کی آس
اس کے ننگے تن پہ کوڑے مار کر	پہرے داروں نے کہا دھتکار کر
کیا ترے مرنے کی باری آ گئی	دیکھ وہ شہ کی سواری آ گئی
وہ مڑا چکرایا اور اوندھا گرا	گھوڑوں کے ٹاپوں تلے روندا گیا
دی رعایا نے صدا ہر سمت سے	"بادشاہِ مہرباں! زندہ رہے"

بندا!

کاش میں تیرے بُنِ گوش میں بُندا ہوتا!
رات کو بے خبری میں جو مچل جاتا میں
تو ترے کان سے چپ چاپ نکل جاتا میں
صبح کو گرتے تری زلفوں سے جب باسی پھول
میرے کھو جانے پہ ہوتا ترا دل کتنا ملول
تو مجھے ڈھونڈتی کس شوق سے گھبراہٹ میں
اپنے مہکے ہوئے بستر کی ہر اک سلوٹ میں
جونہی کرتیں تری نرم انگلیاں محسوس مجھے
ملتا اس گوش کا پھر گوشۂ مانوس مجھے
کان سے تو مجھے ہرگز نہ اتارا کرتی
تو کبھی میری جدائی نہ گوارا کرتی
یوں تری قربتِ رنگیں کے نشے میں مدہوش
عمر بھر رہتا مری جاں میں ترا حلقہ بگوش
کاش میں تیرے بُنِ گوش میں بندا ہوتا!

کہاں؟

موت کی گفتگو نہ کر اے دوست
آہ یہ آرزو نہ کر، اے دوست
جب تلک سانس کی روانی ہے
تیرے جیون کی رت سہانی ہے
جب تلک دل کے داغ روشن ہیں
شش جہت میں چراغ روشن ہیں
دوست! جب تک ترا حریمِ نگاہ
دے رہا ہے تجلیوں کو پناہ
زندگی جام ہے محبت کا
زندگی نام ہے محبت کا
ہم نشیں، کس قدر قریب ہیں ہم
زندگی ہے تو خوش نصیب ہیں ہم
دل سے دل کی طرب نوازی ہے
روح سے روح محو بازی ہے
آنکھیں آنکھوں میں مے انڈیلتی ہیں
انگلیاں گیسوؤں سے کھیلتی ہیں
شانے سے شانہ بھڑ رہا ہے یہاں
نغمے سے نغمہ چھڑ رہا ہے یہاں
جو بھی ارماں دلِ حیات میں ہے
آج تو دامِ ممکنات میں ہے
کل نہ معلوم کیا سے کیا ہو جائے
کل کا مفہوم کیا سے کیا ہو جائے
الجھے الجھے اجل کے دھارے سے
جا کے ٹکرائیں کس کنارے سے

کس نشیمن میں کس ٹھکانے، کہاں۔۔؟
اپنی منزل ہو پھر نہ جانے کہاں؟

رخصت

تھک گئیں آنکھیں، امیدیں سو گئیں، دل مر گیا
زندگی! عزم سفر کر، موت! کب آئے گی تو؟
آنسوؤ! آنکھوں میں اب آنے سے شرماتے ہو کیوں؟
تھیں تمہیں سے میرے داغِ آرزو کی آبرو!
اے کسی کے آستاں کو جانے والے راستے!
بخش دینا! میرا پائے شوق تھا سیماب خو
یہ ترا کتنا بڑا احسان ہے۔۔۔بادِ سحر!
عمر بھر کھیلی مری آہوں کے انگاروں سے تو
اے زمانے کے حسیں صیاد! کیا کہنا ترا؟
جاں گسل ہیں تیرے دامِ خوشنما کے تار و پو
آہ میری روح کو ڈسنے لگی ہے سانس سانس
اب میں رخصت چاہتا ہوں اے جہانِ رنگ و بو!

دنیا

جہاں کی حقیقت کی کس کو خبر ہے
فریبِ نظر تھی فریبِ نظر ہے!
یہی پھول کی زیست کا ماحصل ہے
کہ اس کا تبسم ہی اس کی اجل ہے
نہ سمجھو کہ چشمِ حسیں سرمگیں ہے
نہیں قبر کی تیرگی کی امیں ہے
یہ کیا کہہ رہے ہو کہ ندی رواں ہے
سمندر سے پوچھو کہاں تھی کہاں ہے
نہ سمجھو کہ ہے کیف پرور یہ نغمہ
شکن ہے ہوا کی جبیں پر یہ نغمہ
کہاں دھڑکنیں ہیں دلِ زار کی یہ
صدائیں ہیں اک ٹوٹتے تار کی یہ
یہ ہستی کا دریا بہا جا رہا ہے
ہم آہنگِ سیلِ فنا جا رہا ہے
پھنسے کچھ انوکھے قرینوں میں ہیں ہم
حبابوں کے نازک سفینوں میں ہیں ہم
یہ کیا ہے یہ کیوں ہے خبر کیا خبر کیا
مرے تیرہ ادراک کی ہو سحر کیا!
مری بزمِ دل میں نہیں روشنی کیوں
ہے بے صید میری نگہ کی انی کیوں

یہ دنیا ہے میری کہ مرقد ہے میرا
یہاں بھی اندھیرا وہاں بھی اندھیرا

سازِ فقیرانہ

گلوں کی سیج ہے کیا، مخملیں بچھونا کیا
نہ مل کے خاک میں گر خاک ہوں تو سونا کیا

فقیر ہیں دو فقیرانہ ساز رکھتے ہیں
ہمارا ہنسنا ہے کیا اور ہمارا رونا کیا

ہمیں زمانے کی ان بیکرانیوں سے کام
زمانے بھر سے ہے کم دل کا ایک کونا کیا

نظامِ دہر کو تیورا کے کس لیے دیکھیں
جو خود ہی ڈوب رہا ہو اسے ڈبونا کیا

بساطِ سیل پہ قصرِ حباب کی تعمیر
یہ زندگی ہے تو پھر ہونا کیا، نہ ہونا کیا

نہ رو کہ ہیں ترے ہی اشکِ ماہ و مہر امجدؔ
جہاں کو رکھنا ہے تاریک اگر تو رونا کیا

کنواں

کنواں چل رہا ہے! مگر کھیت سوکھے پڑے ہیں نہ فصلیں، نہ خرمن، نہ دانہ
نہ شاخوں کی باہیں، نہ پھولوں کے نکھڑے، نہ کلیوں کے ماتھے، نہ رت کی جوانی
گزرتا ہے کیاروں کے پیاسے کناروں کو یوں چیرتا۔۔ تیز، خوں رنگ، پانی
کہ جس طرح زخموں کی دکھتی تپکتی تہوں میں کسی نیشتر کی روانی

ادھر دھیری دھیری
کنویں کی نفیری

ہے چھیڑے چلی جا رہی اک ترانہ

پراسرار گانا

جسے سن کے رقصاں ہے اندھے تھکے ہارے بے جان بیلوں کا جوڑا بچارا
گراں بار زنجیریں، بھاری سلاسل، کڑکتے ہوئے آتشیں تازیانے
طویل اور لامنتہی راستے پر بچھا رکھے ہیں دام اپنے قضا نے
ادھر وہ مصیبت کے ساتھی ملائے ہوئے سینگوں سے سینگ، شانوں سے شانے

رواں ہیں نہ جانے
کدھر؟ کس ٹھکانے؟

نہ رکنے کی تاب اور نہ چلنے کا یارا

مقدر نیارا

کنویں والا' گادی پہ لیٹا ہے' مست اپنی بنسی کی میٹھی سریلی صدا میں
کہیں کھیت سوکھا پڑا رہ گیا اور نہ اس تک کبھی آئی پانی کی باری
کہیں بہہ گئی ایک ہی تند ریلے کی' فیاض' لہروں میں کیاری کی کیاری
کہیں ہوگئیں دھول میں دھول لاکھوں' رنگا رنگ فصلیں' ثمر دار ساری
پریشاں پریشاں'
گریزاں گریزاں'

تڑپتی ہیں خوشبوئیں دامِ ہوا میں

نظامِ فنا میں

اور اک نغمۂ سرمدی کان میں آ رہا ہے' مسلسل' کنواں چل رہا ہے
پیا پے مگر نرم رو اس کی رفتار' پیہم مگر بے تکان اس کی گردش
عدم سے ازل تک' ازل سے ابد تک' بدلتی نہیں ایک آن اس کی گردش
نہ جانے لیے اپنے دولاب کی آستینوں میں کتنے جہان اس کی گردش
رواں ہے رواں ہے
تپاں ہے تپاں ہے

یہ چکر یونہی جاوداں چل رہا ہے

کنواں چل رہا ہے

سوکھا تنہا پتّا

اس بیری کی اونچی چوٹی پر وہ سوکھا پتا!
جس کی ہستی کا بَیری ہے پت جھڑ کی رت کا ہر جھونکا
کاش مری یہ قسمت ہوتی، کاش میں وہ اک پتا ہوتا
ٹوٹ کے جھٹ اس ٹہنی سے گر پڑتا، کتنا اچھا ہوتا
گر پڑتا، اس بیری والے گھر کے آنگن میں گر پڑتا
یوں ان پازیبوں والے پاؤں کے دامن میں گر پڑتا
جس کو میرے آنسو پوجیں، اس گھر کے خاشاک میں مل کر
جس کو میرے سجدے ترسیں، اس دوارے کی خاک میں مل کر
اس آنگن کی دھول میں مل کر مٹتا مٹتا مٹ جاتا میں
عمر بھر ان قدموں کو اپنے سینے پر مضطر پاتا میں
ہائے! مجھ سے نہ دیکھا جائے، آیا ہوا کا جھونکا آیا
ڈالیاں لرزیں، ٹہنیاں کانپیں، لو وہ سوکھا پتہ ٹوٹا

ملاقات

تم کو شہروں نے پکارا، سبزہ زاروں نے مجھے
تم کو پھولوں نے صدا دی اور خاروں نے مجھے
میں انہی پگڈنڈیوں پر بانسری چھیڑا کیا
بے ارادہ، جانے کس کا، راستہ دیکھا کیا
جب ندی پر تر مراتا شام کی مہندی کا رنگ
میرے دل میں کانپ اٹھتی کوئی ان بوجھی امنگ
جب کھلنڈری ہرنیوں کی ڈار بن میں ناچتی
کوئی بے نام آرزو سی میرے من میں ناچتی
ریت کے ٹیلے پہ سرکنڈوں کی لہراتی قطار
نیم شب! میں! اور میری بنسری! اور انتظار!
آہ یہ سر سبز میداں، دم بخود، لامنتہی
جن کی وسعت میں جوانی میری آوارہ رہی

بعد مدت کے تمھارا آج ادھر آنا ہوا
وہ زمانہ بچپنے کا' آہ' افسانہ ہوا
کتنے سلجھے بال' کیسی نرم و نازک آستیں،
ہنس رہے ہو؟ اک تمھارا قہقہہ بدلا نہیں
مجھ کو دیکھو میں ابھی وابستۂ آغاز ہوں
ان حسیں ویرانیوں میں گوش برآواز ہوں
دوڑتی جاتی ہے دنیا وقت کے محمل کے ساتھ
میرے حصے میں وہی بیتاب دن' بیخواب رات
ڈھونڈتا ہوں' گم ہوئی ہے میری دنیائے حسیں
ہاں' انہی پھیلے بیابانوں کے پچھم میں کہیں!
ایک دن جب میرے مرنے کی خبر پائے گی وہ
میری تربت پر تو آئے گی' ضرور آئے گی وہ

غزل

یہ کیا عجیب راز ہے سمجھ سکوں تو بات ہے
نہ اب وہ ان کی بے رخی نہ اب وہ التفات ہے

میری تباہیوں کا بھی فسانہ کیا فسانہ ہے
نہ بجلیوں کا تذکرہ نہ آشیاں کی بات ہے

یہ کیا سکوں ہے؟ اس سکوں میں کتنے اضطراب ہیں
یہ کس کا میرے سینے پر خنک سا ہات ہے

نگاہ میں بسا بسا' نگاہ سے بچا بچا
رکا رکا' کھچا کھچا' یہ کون میرے سات ہے؟

چراغ بجھ چکے' پتنگے جل چکے' سحر ہوئی
مگر ابھی مری جدائیوں کی رات' رات ہے

کون؟

چاندی کی پازیب کے بجتے گھنگھروؤں سے کھیلے
ریشم کی رنگیں لنگی کی سرخ البیلی ڈوری
نازک نازک پاؤں برقعے کو ٹھکراتے جائیں
چھم چھم بجتی جائے پائل، ناچتی جائے ڈوری!
ہائے سنہری تلے کی گلکاری والی چپلی
جس سے جھانکے مست سہاگن مہندی چوری چوری
جانے کتنی سندر ہو گی روپ نگر کی رانی
اف چپلی میں سکڑی سکڑی انگلیاں گوری گوری
جھونکوں کی خوشبو، دروں میں نور، لٹاتی جائے
مجھ بھاگوں کے مارے کی قسمت کوری کی کوری!

غزل

کیا گریباں چاکِ صبح اور کیا پریشاں زلفِ شام
وقت کی لامنتہی زنجیر کی کڑیاں تمام

دیکھیے تنکے کی ناؤ کب کنارے جا لگے
موج ہے دہشت خروش اور سیل ہے وحشت خرام

شمع کے دامن میں شعلہ، شمع کے قدموں میں راکھ
اور ہو جاتا ہے ہر منزل پہ پروانے کا نام

زیست کی صہبا کی رو تھمتی نہیں، تھمتی نہیں!
ٹوٹتے رہتے ہیں نشے، پھوٹتے رہتے ہیں جام

دستک

کس نے دروازہ کھٹکھٹایا ہے؟
جا کے دیکھوں تو، کون آیا ہے؟

کون آیا ہے میرے دوارے پر
رات آئی کہاں بچارے پر!

میرے چھپر سے ٹیک کر کاندھا
کون استادہ ہے تھکا ماندہ؟

میری کٹیا میں آؤ، ستا لو،
یہ مرا ساغرِ شکستہ لو!

میری چھاگل سے گھونٹ پانی پیو
اک نئے عزم کی جوانی پیو

ٹمٹماتے دیے کی جھلمل میں
جوت سلگا لو اک نئی دل میں

یہ مرے آنسوؤں کی شبنم لو
پاؤں کے آبلوں کی مرہم لو

یہ مجھے افتخار دو، بیٹھو
سر سے گٹھڑی اتار دو، بیٹھو

میرے زانو پر اپنا سر رکھ کر
طاق پر کاہشِ سفر رکھ کر

نیند کی انجمن میں کھو جاؤ
منزلوں کے سپن میں کھو جاؤ

خواب، وادی و کوہسار کے خواب
دشت و دریا و آبشار کے خواب

خواب، اندھیری طویل راہوں کے
کنجِ صحرا کی خیمہ گاہوں کے

جہاں اک شمع ابھی فروزاں ہے
جہاں اک دل تپاں ہے سوزاں ہے

تم لپٹ جاؤ ان خیالوں سے
اور میں کھیلوں تمھارے بالوں سے
صبح جب نور کا فسوں برسے
سونی پگڈنڈیوں پہ خوں برسے
باگ تھامے حسیں ارادوں کی
تم خبر لو پھر اپنے جادوں کی
جب تلک زیست کا سفینہ بہے
اجنبی اجنبی کو یاد رہے
مجھ کو یہ اپنی یاد دے جاؤ
آؤ بھی! کیوں جھجکتے ہو! آؤ!
تم کہاں ہو؟ کہاں؟ جواب تو دو
او مرے میہماں! جواب تو دو
تم نے دروازہ کھٹکھٹایا تھا!
کس کی دستک تھی؟ کون آیا تھا؟
نیم شب! قافلے ستاروں کے!
تیز ہر کارے ابر پاروں کے!

کس نے نیندوں کو میری ٹوکا تھا؟
کوئی جھونکا تھا؟ کوئی دھوکا تھا؟

نعتیہ مثنوی

شہرِ مکہ بتوں کی بستی ہے — چار سو تیرگی برستی ہے
لو وہ اک نور کی کرن پھوٹی — بزمِ آفاق جگمگا اٹھی
دیکھنا اک یتیمِ بے ساماں — بے نوا، کم سخن، تہی داماں
جس نے یوں سال و سن گزارے ہیں — بھوک میں اپنے دن گزارے ہیں
پیرہن تن پہ تار تار اس کا — کوئی محرم نہ دوستدار اس کا
تپتی ریتوں پہ محوِ خواب کہیں — تیز کانٹوں سے زخمیاب کہیں
چلتی تیغوں کے درمیان کبھی — کنکروں سے لہولہان کبھی
ذرہ ذرہ عدوئے جاں اس کا — تشنۂ خوں ہے اک جہاں اس کا
ہاں مگر لب جب اس کے ہلتے ہیں — دل کے مرجھائے پھول کھلتے ہیں
جب وہ پیغامِ حق سناتا ہے — وجد میں دو جہاں کو لاتا ہے
جب وہ اونچی صدا سے کہتا ہے — ہادیانہ ادا سے کہتا ہے
کم رہو! تم یہ کیا سمجھتے ہو — پتھروں کو خدا سمجھتے ہو
دل دہلتے ہیں قہرمانوں کے — دیے بجھتے ہیں کفر خانوں کے
بات یہ کیا زباں سے نکلی — لاکھ تلوار میاں سے نکلی
ظالموں کی اذیتیں اک سمت — اور خدا کی مشیتیں اک سمت



دیکھنا تیز دھوپ کی لو میں — آندھیوں کی شرارہ گوں رو میں
مکے سے دور اور مدینے کے پاس — جا رہا ہے کوئی بہشت انفاس
جا رہا ہے وہ کوئی راہ نورد — دو جہاں اس کی پاک پلکوں کی گرد
سانڈنی پر سوار جاتا ہے — درمیانِ غبار جاتا ہے
ساتھ اک صدقِ جاں روانہ ہے — عشق کا کارواں روانہ ہے
سرِ مکہ کچھ اور منظر ہے — مرتضیٰؓ ہے نبیؐ کا بستر ہے
شب ہے اندھیرا گہرا گہرا ہے — چار سو قاتلوں کا پہرا ہے
وہ پیمبر کی چارپائی پر — ہنستا ہے بے سمجھ خدائی پر



سوئے یثرب نبیؐ کی باگ اٹھی — کفر کے خرمنوں سے آگ اٹھی
روئے صحرا کے ٹیلے ٹیلے پر — آج قدغن ہے ہر قبیلے پر
اس طرف سے رسولؐ اگر گزرے — تو وہ کٹوا کے اپنا سر گزرے
آہ وہ راستہ بیاباں کا — خطِ نوری جبینِ ایماں کا
اس کی پاکیزہ خاک کیا کہنا! — خاک اور تابناک کیا کہنا؟
جس کے ذروں کو رشکِ ماہِ تمام — کر گیا ناقۂ نبیؐ کا خرام
نقشِ پا دے کے جس کے سینے کو — میرا آقاؐ گیا مدینے کو

کاش وہ خاک مجھ کو مل جائے — سرمۂ پاک مجھ کو مل جائے
میں اسے رکھ کر آنکھ کے تل میں — آنکھ کے تِل میں، دیدۂ دل میں
جگمگاتا پھروں زمانے میں — زندگی کے سیاہ خانے میں



جو نبیؐ کے قریب ہیں وہ لوگ — کس قدر خوش نصیب ہیں وہ لوگ
اس کے قدموں کیساتھ رہتے ہیں — اس کی موجوں کیساتھ بہتے ہیں
اس کے ابرو کے ہر اشارے پر — تیرتے ہیں لہو کے دھارے پر
اس کی عزت پہ سر کٹاتے ہیں — آخری وقت مسکراتے ہیں
ان کے قدموں میں دولتِ کونین — ان کا ایک ایک سانس بدرو حنین
ہاں وہ دیکھو بلالؓ کی حالت — چور زخموں سے خون میں لت پت
گرم ریتی پہ تلملاتا ہے — تازیانوں کی چوٹ کھاتا ہے
موت کا خوف ہے نہ زیست کی فکر — اس کے ہونٹوں پہ لاالہ کا ذکر



دیکھنا جنگ احد کی جاری ہے — وقت اسلامیوں پہ بھاری ہے
چارسو کافروں کا ریلا ہے — ابنِ سکّن زیادؓ اکیلا ہے
اس نے دیکھا کہ چند پیکرِ شر — وار کرنے کو ہیں محمدؐ پر
دوڑ کر آ کے درمیان نبیؐ — جان دے کر بچائی جان نبیؐ

لاش اس کی اٹھا کے لاتے ہیں سامنے مصطفیٰؐ کے لاتے ہیں
ابھی کچھ اس میں ہوش باقی ہے اک نفس کا خروش باقی ہے
دمِ آخر کے وقتِ مشکل میں ابھی کچھ آرزو سی ہے دل میں
اپنے سینے کے بل گھسٹتا ہے پائے محبوبؐ سے چمٹتا ہے
ان کے قدموں کو چوم لیتا ہے مسکراتا ہے جان دیتا ہے
آہ یہ رتبۂ فدائے نبیؐ آخری سانس اور بہ پائے نبیؐ
آہ یہ شمعِ حق کے پروانے دُرجِ انسانیت کے دُردانے
کیا محبت ہے کیا ارادت ہے موت ان کے لیے عبادت ہے



جنگِ موتہ کا اک سماں دیکھو زیدؓ کے ہاتھ میں نشاں دیکھو
زیدؓ وہ اک غلامِ پاک نہاد جس کو اسلام نے کیا آزاد
جب نبیؐ کی اسے غلامی ملی دونوں عالم میں شاد کامی ملی
ہر گھڑی راحتوں میں صدموں میں ہے وہ شاہِ عرب کے قدموں میں
یہ ہے رنگِ اخوتِ اسلام آج سردارِ فوج ہے وہ غلام
وہ جری تیس سو سپاہ کے ساتھ لڑتا ہے فوجِ بے پناہ کے ساتھ
ہو محبت رسولؐ سے جس کو لائے خاطر میں وہ بھلا کس کو
اس کی ہمت کو کون ٹوک سکے اس کے طوفاں کو کون روک سکے
ہیں رواں زندگی کے ہنگامے تسمہ اس کی رکاب کا تھامے

جو کچھ اس محفلِ حیات میں ہے
اسکی باگ اسکے پاک ہات میں ہے
موت اس کیلئے ہے شیریں جام
آخری گھونٹ اور عمرِ دوام
آ رہی ہے وہ فتحیاب سپاہ
لاش زیدِ شہید کے ہمراہ
میرِ لشکر نہیں ہے لشکر میں
صفِ ماتم بچھی ہے گھر گھر میں
وہ گہر اب نہیں خزینے میں
ایک کہرام ہے مدینے میں
آب گوں دیدۂ پیمبرؐ ہے
مرنے والے کا کیا مقدر ہے
اسکے زخموں کا خون چہرے کی دھول
پا رہی ہے نبیؐ کی آنکھ سے پھول
وہ عدم کی طرف روانہ ہے
ساتھ یہ بے بہا خزانہ ہے
اس کی بچی کو دیکھ کر رنجور
اس کے اشکوں کو چومتے ہیں حضورؐ
باپ کا صدمہ کیا پڑا اس پر
جھک پڑی رحمتِ خدا اس پر
رحمتِ دوجہاں کے سائے میں
فرق کیا اپنے اور پرائے میں
جس کے سر پر نبیؐ کا سایہ ہے
اس کی دنیا ہے اس کی مایا ہے
اس کا جینا ہے اس کا مرنا ہے
ڈوب کر بھی اسے ابھرنا ہے
ایک منزل ہے اس کے ایماں کی
سربلندی مقامِ انساں کی
لو لگا کر خدا کی ہستی سے
آدمی کو اٹھانا پستی سے
روح میں شورشیں زمانوں کی
سانس میں کروٹیں جہانوں کی
دل میں سامان سو اجالے کا
ہاتھ میں پلو کملی والے کا

گاڑی میں۔۔۔

یہ بیکراں فضائیں جہاں اپنے چہرے سے
پردہ الٹ دیا ہے نمودِ حیات نے
شاداب مرغزار کہ دیکھی ہے جس جگہ
اپنے نمو کی آخری حد' ڈال پات نے
گنجان جھنڈ جن کے تلے کہنہ سال دھوپ
آئی کبھی نہ سوت شعاعوں کا کاتنے
پیڑوں کے شاخچوں پہ چہکتے ہوئے طیور
تاکا جنہیں کبھی نہ شکاری کی گھات نے
تم کتنے خوش نصیب ہو آزاد جنگلو!
اب تک تمھیں چھوا نہیں انساں کے ہات نے
اب تک تمھاری صبح کو دھندلا نہیں کیا
تہذیب کے نظام کی تاریک رات نے

پھینکی نہیں تمھارے مقام بلند پر
کوئی کمند سلسلۂ حادثات نے
اچھے ہو تم کہ تم کو پریشاں نہیں کیا
انسانیت کے دل کی کسی واردات نے
اے وائے اس حسین بیاباں کو کس طرح
نیندوں سے بھر دیا ہے نسیمِ حیات نے
ان وسعتوں میں کلبہ و ایواں کوئی نہیں
ان کنکروں میں بندہ و سلطاں کوئی نہیں

طلوعِ فرض

سحر کے وقت دفتر کو رواں ہوں
رواں ہوں، ہمرہِ صد کارواں ہوں

سرِ بازار انسانوں کا انبوہ
کسی دستِ گل اندوزِ حنا میں
زمانے کی حسیں رتھ کی لگا میں
کسی کف پر خراشِ خارِ محنت
عدم کے راستے پر آنکھ میچے
کوئی آگے رواں ہے کوئی پیچھے

سڑک کے موڑ پر نالی میں پانی
تڑپتا تلملاتا جا رہا ہے
وہی مجبوریٔ افتاد مقصد
جو اس کی کاہشِ رفتار میں ہے
مرے ہر گامِ ناہموار میں ہے

کوئی خاموش پنچھی اپنے دل میں
امیدوں کے سنہرے جال بن کے
اڑا جاتا ہے چگنے دانے دنکے
فضائے زندگی کی آندھیوں سے
ہے ہر اک کو بچشمِ تر گزرنا۔
مجھے چل کر اسے اڑ کر گزرنا

وہ اک اندھی، بھکارن لڑکھڑائی
کہ چوراہے کے کھمبے کو پکڑ لے
صدا سے راہگیروں کو جکڑ لے
یہ پھیلا پھیلا، میلا میلا دامن
یہ کاسہ، یہ گلوئے شور انگیز
مرا دفتر، مری مسلیں، مرا میز

ابھی کمسن ہے اس کو کیا پڑی ہے
جسے جزداں بھی اک بارِ گراں ہے
وہ بچہ بھی سوئے مکتب رواں ہے
شریکِ کاروانِ زندگانی!
یہ کیا ہے مالکِ زندانِ تقدیر!
جوان و پیر کے پاؤں میں زنجیر!

شبِ رفتہ کی یادوں کو بھلانے
دکاں پر پان کھانے آ گئی ہے
جہاں کا منہ چڑانے آ گئی ہے
ہے "اس" میں، مجھ میں کتنا فرق! لیکن
کہ آنے والی شب کیسے کٹے گی!

چمکتی کار فراٹے سے گزری
غبارِ رہ نے کروٹ بدلی، جاگا
اٹھا اک دو قدم تک ساتھ بھاگا
پیاپے ٹھوکروں کا یہ تسلسل!
یہی پرواز بھی، افتادگی بھی،
متاعِ زیست اس کی بھی، مری بھی

گلستاں میں کہیں بھونرے نے چوسا
گلوں کا رس، شرابوں سا نشیلا
کہیں پر گھونٹ اک کڑوا کسیلا
کسی سڑتے ہوئے جوہڑ کے اندر
پڑا اک رینگتے کیڑے کو پینا،
مگر مقصد وہی: دو سانس جینا

وہ نکلا پھوٹ کر نورِ سحر سے
نظامِ زیست کا دریائے خوناب
پسینوں، آنسوؤں کا ایک سیلاب
کہ جس کی رو میں بہتا جا رہا ہے
گدا گر کا کدو بھی جامِ جم بھی،
کلھاڑی بھی، درانتی بھی، قلم بھی،!

سحر کے وقت دفتر کو رواں ہوں
رواں ہوں، ہمرہِ صد کارواں ہوں

کلبہ و ایواں

گھاس کی گٹھڑی کے نیچے وہ روشن چہرہ
روپ، جو شاہی ایوانوں کے پھولوں کو شرمائے
راہگزر پر سوکھے پتے چننے والی باہیں۔۔۔
باہیں جن کو دیکھ کے موجِ کوثر بل کھا جائے
بیلوں کے چھکڑوں کے پیچھے چلتے زخمی پاؤں
پاؤں، جن کی آہٹ سوئی تقدیروں کو جگائے
بھیک کے اک ٹکڑے کو ترستی کھوئی کھوئی آنکھیں
پلکیں، جن کے نیچے لاکھوں دنیاؤں کے سائے
یہ زخمی روحیں، یہ دکھتے دل، یہ جلتے سینے
کوئی انھیں سمجھائے جا کر کوئی انھیں بتلائے

تم اچھے ہو ان ہونٹوں سے جن کی خونیں سرخی
محلوں کے سینوں کے اندر آگ لگاتی جائے
تم اچھے ہو ان زلفوں سے، جن کی ظالم خوشبو
پھولوں کی وادی میں ناگن بن کر ڈسنے آئے
تم خوش قسمت ہو ان آنکھوں سے جن کی تنویریں
سونے چاندی کے ایوانوں میں، مرگھٹ کے سائے

وہ چھپر اچھے، جن میں ہوں دل سے دل کی باتیں
ان بنگلوں سے جن میں بسیں گونگے دن، بہری راتیں

دل دریا سمندروں ڈونگھے۔۔۔

اتنی آنکھیں، اتنے ماتھے، اتنے ہونٹ
چشمکیں، تیور، تبسم، قہقہے
اس قدر غماز، اتنے ترجماں
اور پھر بھی لاکھ پیغام ان کہے
لاکھ اشارے جو ہیں اَن بوجھے ابھی
لاکھ باتیں جو ہیں گویائی سے دور
دور۔۔۔دل کے کنجِ ناموجود میں
روز و شب موجود، پیچاں، ناصبور!
کون اندھیری گھاٹیوں کو پھاند کر
جائے ان پر شور سناٹوں کے پار
گونجتے ہیں لاکھ سندیسے جہاں
کان سن سکتے نہیں جن کی پکار!

یہ جبینوں پر لکیریں۔۔موج موج!
کتنے افسانوں کی ژولیدہ سطور
انکھڑیوں میں ترمراتی ڈوریاں
کتنے قصوں کی زبانِ بے شعور
جامِ لب کی کھنکھناہٹ میں نہاں
کتنے مے خانوں کا شورِ بے خروش
اک تبسمؔ اک تکلمؔ اک نگاہ
کتنے احساسات کی صوتِ خموش!

کون الٹ سکتا ہے یہ بوجھل نقاب
پردہ در پردۂ حجاب اندر حجاب
اس طرف میں گوش بر آواز ہوں
اس طرف ہر ذرہ اک بجتا رباب
کس کو طاقت؟ کس کو یارا؟ کس کو تاب؟
کون ان بیاکل صداؤں کو سنے
اور ضمیرِ ہر صدا میں ڈوب کر
کون دل کے باغ کی کلیاں چنے!

کاش میں اتنا سمجھ سکتا کبھی
جب کوئی کرتا ہے مجھ سے ہنس کے بات
کیا یہ ہو سکتا ہے وقتِ گفتگو
اس کا دل بھی ہنستا ہو ہونٹوں کے سات

مجھ خرابِ آرزو کے حال پر
پھوٹ پڑتی ہے کسی کی آنکھ جب
مجھ کو ڈس جاتا ہے یہ چبھتا خیال:
اس کا دل مجھ پر نہ ہو خندہ بلب!

کیا یہ سب سچ ہے جو کہتے ہیں یہ ہونٹ
ہونٹ، دھبے روح کے قرطاس پر
ہونٹ، قصرِ دل کے دروازے پہ قفل
ہونٹ، مہریں نامۂ احساس پر

اور ان آنکھوں پہ کس کو اعتبار؟
آنکھیں پردے روزنِ ادراک کے
کس طرح سمجھیں رموزِ زیست کو
آئینے پر دو کھلونے خاک کے!

کس طرح مانوں کہ یہ سب سچ ہے سچ
مجھ سے جو کہتے ہیں اس دنیا کے لوگ
چھو سکا ہے ان کے سینوں کو کبھی
میرے دل کا درد! میرے من کا روگ!

پنواڑی

بوڑھا پنواڑی! اس کے بالوں میں مانگ ہے نیاری
آنکھوں میں جیون کی بجھتی اگنی کی چنگاری۔۔۔
نام کی اک ہٹی کے اندر بوسیدہ الماری
آگے پیتل کے تختے پر اس کی دنیا ساری
پان' کتھا' سگرٹ' تمباکو' چونا' لونگ' سپاری
عمر اس بوڑھے پنواڑی کی پان لگاتے گزری
چونا گھولتے' چھالیا کاٹتے' کتھ پگھلاتے گزری
سگرٹ کی خالی ڈبیوں کے محل سجاتے گزری
کتنے شرابی مشتریوں سے نین ملاتے گزری
چند کسیلے پتوں کی گتھی سلجھاتے گزری

کون اس گتھی کو سلجھائے، دنیا ایک پہیلی
دو دن ایک پھٹی چادر میں دکھ کی آندھی جھیلی
دو کڑوی سانسیں لیں، دو چلموں کی راکھ انڈیلی
اور پھر اس کے بعد نہ پوچھو، کھیل جو ہونی کھیلی
پنواڑی کی ارتھی اٹھی، بابا، اللہ بیلی

صبح بھجن کی تان منوہر جھنن جھنن لہرائے
ایک چتا کی راکھ ہوا کے جھونکوں میں کھو جائے
شام کو اس کا کمسن بالا بیٹھا پان لگائے
جھن جھن، ٹھن ٹھن چونے والی کٹوری بجتی جائے
ایک پتنگا دیپک پر جل جائے، دوسرا آئے

ایک نظم

دوست، یہ سب سچ ہے، لیکن زندگی
کاٹنی تو ہے، بسر کرنی تو ہے!
گھات میں ہو منتظر چلّے پہ تیر
ہرنیوں نے چوکڑی بھرنی تو ہے
کاٹ دیں کتنی رتوں کی گردنیں،
بھاگتے لمحوں کے چلتے آروں نے
ہاں، یہ سب سچ ہے، پر اس کا کیا علاج
چار دن جینا ہے ہم بے چاروں نے
ہم نے بھی اپنی نحیف آواز کو
شاملِ شورِ جہاں کرنا تو ہے!
زندگی اک گہری، کڑوی، لمبی سانس
دوست، پہلے جی بھی لیں، مرنا تو ہے

موت کتنی تیرہ و تاریک ہے!
ہو گی، لیکن مجھ کو اس کا غم نہیں
قبر کے اندھے گڑھے کے اس طرف
اس طرف، باہر، اندھیرا کم نہیں

ہاں اسی گم سم اندھیرے میں ابھی
بیٹھ کر وہ راکھ چننی ہے ہمیں
راکھ، ان دنیاؤں کی، جو جل بجھیں
راکھ، جس میں لاکھ خونیں شبنمیں
زیست کی پلکوں سے ٹپ ٹپ پھوٹتی
جانے کب سے، جذب ہوتی آئی ہیں
کتنی روحیں، ان زمانوں کا خمیر
اپنے اشکوں میں سموتی آئی ہیں

جانتا ہوں، میرے دل کی آگ کو
چند ماہ و سال کے ایندھن کا ڈھیر
دیر تک تابندہ رکھ سکتا نہیں

زیست امکانات کا اک ہیر پھیر
کیا عجب ہے، میرے سینے کا شرر
اک تمنائے بغل گیری کے سات
وقت کے مرگھٹ پہ باہیں کھول دے
اک نرالی صبح بن جائے یہ رات

لاہور میں

ڈاک خانے کے ٹکٹ گھر پر خریداروں کی بھیڑ!
ایک چوبی طاقچے پر کچھ دواتیں۔۔۔اک قلم
یہ قلم میں نے اٹھایا اور خط لکھنے لگا:۔
"پیارے ماموں جی!
"دعا کیجیے۔۔۔خدا۔۔۔رکھ لے۔۔۔بھرم
آج انٹرویو ہے!۔۔۔کل تک فیصلہ ہو جائے گا
دیکھیں کیا ہو؟ مجھ کو ڈر ہے۔۔۔"
اتنے میں تم آگئیں!
"اک ذرا تکلیف فرما کر پتہ لکھ دیجیے"
میں نے تم سے وہ لفافہ لے لیا، جھجکا نہیں،
"بے دھڑک" لکھ ڈالا میں نے "کانپتے ہاتھوں" کیساتھ
مختصر، رنگیں پتہ: "گلگت میں۔ گوہر خاں کے نام!"
"شکریہ"۔۔۔"جی کیسا؟"۔۔۔اک ہنستی نگہ زیرِ نقاب
ڈاک میں خط۔۔۔! تانگہ ٹمپل روڈ کو۔۔۔قصہ تمام!

ایک پرنشاط جلوس کے ساتھ

کون ۔۔ اس اونچی چھت کی بوسیدہ منڈیروں کے قریب؟

نیچے خلعت پوش بازاروں میں، سیلابِ سرور!
ناچتے پاؤں، ۔۔ تھرکتی باہیں، ۔۔ محوِ نغمہ ہونٹ

میں بھی آ نکلا ہوں ۔۔ اتنی دور سے ۔۔ دردوں سے چور
صرف اس امید پر! شاید کہ گزرے اب کے بھی،
تیرے گھر کے سامنے والی سڑک کے پاس سے
اس حسیں تہوار کی رنگینیوں کا کارواں ۔۔۔!

شاید اب کے پھر بھی، شوقِ دید کے احساس سے
تو بھی آ نکلے سرِ بام ۔۔ آہ یہ سودائے خام!

جا رہا ہوں زر فشاں پوشاک میں لپٹا ہوا
زر فشاں پوشاک کے نیچے دلِ حسرت نصیب
اک شرر، پیراہنِ خاشاک میں لپٹا ہوا

آج کیوں ان ٹھوکروں کی پے بہ پے افتاد میں
اک عجب آسودگی محسوس ہوتی ہے مجھے
کیوں اس انبوہِ رواں کی شورشوں کے درمیاں
اک حسیں موجودگی محسوس ہوتی ہے مجھے

پاؤں تو اٹھتے ہیں۔۔ لیکن آنکھ اٹھ سکتی نہیں
جا رہا ہوں میں نہ جانے کس سے شرماتا ہوا
میں لرز اٹھتا ہوں کس کی ٹکٹکی کے وہم سے؟
میں جھجک جاتا ہوں کس کے سامنے آتا ہوا؟

کس کا چہرہ ہے؟ کہیں ان گھونگھٹوں کے درمیاں۔
چوڑیوں والی کلائی؟ جھومروں والی جبیں؟
ممٹیوں پر سے پھسلتا ہی نہیں کنکر کوئی!
کون ہے موجود؟ جو موجود بھی شاید نہیں!!

امروز

ابد کے سمندر کی اک موج جس پر مری زندگی کا کنول تیرتا ہے
کسی ان سنی راگنی کی کوئی تان۔ آزردہ' آوارہ' برباد
جو دم بھر کو آ کر مری الجھی الجھی سی سانسوں کے سنگیت میں ڈھل گئی ہے
زمانے کی پھیلی ہوئی بیکراں وسعتوں میں یہ دو چار لمحوں کی میعاد
طلوع و غروب مہ و مہر کے جاودانی تسلسل کی دو چار کڑیاں'
یہ کچھ تھرتھراتے اجالوں کا روماں' یہ کچھ سنسناتے ادھیروں کا قصہ
یہ جو کچھ کہ میرے زمانے میں ہے اور یہ جو کچھ کہ اس کے زمانے میں میں ہوں
یہی میرا حصہ ازل سے ابد کے خزانوں سے ہے بس یہی میرا حصہ!

مجھے کیا خبر' وقت کے دیوتا کی حسیں رتھ کے پہیوں تلے پس چکے ہیں
مقدر کے کتنے کھلونے: زمانوں کے ہنگامے' صدیوں کے صد ہا ہیولے
مجھے کیا تعلق۔ مری آخری سانس کے بعد بھی دوشِ گیتی پہ مچلے
مہ و سال کے لازوال آبشار رواں کا وہ آنچل' جو تاروں کو چھو لے

مگر آہ یہ لمحۂ مختصر۔ جو مری زندگی' میرا زادِ سفر ہے!
مرے ساتھ ہے' میرے بس میں ہے' میری ہتھیلی پہ ہے یہ لبالب پیالہ
یہی کچھ ہے لے دے کے میرے لیے اس خراباتِ شام وسحر میں یہی کچھ!
یہ اک مہلتِ کاوشِ دردِ ہستی! یہ اک فرصتِ کوششِ آہ و نالہ!

یہ صہبائے امروز' جو صبح کی شاہزادی کی مست انکھڑیوں سے ٹپک کر
بدورِ حیات آ گئی ہے! یہ ننھی سی چڑیاں جو چھت میں چہکنے لگی ہیں!
ہوا کا یہ جھونکا جو میرے دریچے میں تلسی کی ٹہنی کو لرزا گیا ہے
پڑوسن کے آنگن میں' پانی کے نلکے پہ یہ چوڑیاں جو چھنکنے لگی ہیں!
یہ دنیائے امروز میری ہے' میرے دلِ زار کی دھڑکنوں کی امیں ہے
یہ اشکوں سے شاداب دو چار صبحیں' یہ آہوں سے معمور دو چار شامیں!
انہی چلمنوں سے مجھے دیکھنا ہے وہ جو کچھ کہ نظروں کی زد میں نہیں ہے

ایک دعا

(جسے درجہ قبولیت نصیب ہوا)

خلاقِ دو جہاں! مری آنکھوں کو نور دے
چھینی ہوئی یہ دولتِ کیف و سرور دے
پھر قوتِ نظارۂ دشت و دیار بخش!
پھر طاقتِ مشاہدۂ نزد و دور دے
مجھ پر نگاہِ مہرِ سمیعٌ بصیر کر
مجھ کو نویدِ لطفِ خدائے غفور دے
اللہ! مجھ کو دیدۂ بینندہ کر عطا
مولا! تو ہی دوائے دلِ ناصبور دے
پھر سونپ میری آنکھوں کو آنکھوں کی روشنی
یہ میری چیز پھر مجھے دے اور ضرور دے

ایک کوہستانی سفر کے دوران

تنگ پگڈنڈی۔۔۔سرِ کہسار بل کھاتی ہوئی
نیچے، دونوں سمت، گہرے غار، منہ کھولے ہوئے
آگے، ڈھلوانوں کے پار اک تیز موڑ اور اس جگہ
اک فرشتے کی طرح نورانی پر تولے ہوئے
جھک پڑا ہے آ کے رستے پر کوئی نخلِ بلند
تھام کر جس کو گزر جاتے ہیں آسانی کے ساتھ
موڑ پر سے، ڈگمگاتے رہرووں کے قافلے
ایک بوسیدہ، خمیدہ پیڑ کا کمزور ہاتھ،
سینکڑوں گرتے ہوؤں کی دستگیری کا امیں!
آہ! ان گردن فرازانِ جہاں کی زندگی
اک جھکی ٹہنی کا منصب بھی جنھیں حاصل نہیں

غزل

جنونِ عشق کی رسم عجیب' کیا کہنا۔۔!
میں ان سے دور' وہ میرے قریب' کیا کہنا۔۔!

یہ تیرگی مسلسل میں ایک وقفۂ نور
یہ زندگی کا طلسمِ عجیب' کیا کہنا۔۔!

جو تم ہو برقِ نشیمن' تو میں نشیمنِ برق
الجھ پڑے ہیں ہمارے نصیب' کیا کہنا۔۔!

ہجومِ رنگ فراواں سہی۔۔ مگر پھر بھی
بہار۔۔ نوحۂ صد عندلیب' کیا کہنا۔۔!

ہزار قافلۂ زندگی کی تیرہ شبی
یہ روشنی سی افق کے قریب' کیا کہنا۔۔!

لرز گئی تری لو میرے ڈگمگانے سے
چراغِ گوشۂ کوئے حبیب' کیا کہنا۔۔!

راتوں کو۔۔۔

آنکھوں میں کوئی بس جاتا ہے
میٹھی سی ہنسی ہنس جاتا ہے
احساس کی لہریں ان تاریک جزیروں سے ٹکراتی ہیں
جہاں نغمے پنکھ سنوارتے ہیں!
سنگین فصیلوں کے گنبد سے پہرے دار پکارتے ہیں
"کیا کرتا ہے؟"
دل ڈرتا ہے!
دل ڈرتا ہے ان کالی اکیلی راتوں سے دل ڈرتا ہے

ان سونی تنہا راتوں میں
دل ڈوب کے گزری باتوں میں
جب سوچتا ہے، کیا دیکھتا ہے، ہر سمت دھوئیں کا بادل ہے
وادی و بیاباں جل تھل ہے
ذخار سمندر سوکھے ہیں، پر ہول چٹانیں پگھلی ہیں
دھرتی نے ٹوٹتے تاروں کی جلتی ہوئی لاشیں نگلی ہیں

پہنائے زماں کے سینے پر اک موج انگڑائی لیتی ہے!
اس آب و گل کی دلدل میں اک چاپ سنائی دیتی ہے
اک تھرکن سی، اک دھڑکن سی، آفاق کی ڈھلوانوں میں کہیں
تانیں جو ہمک کر ملتی ہیں، چل پڑتی ہیں، رکتی ہی نہیں،
ان راگنیوں کے بھنور بھنور میں صدہا صدیاں گھوم گئیں
اس قرن آلود مسافت میں لاکھ آبلے پھوٹے، دیپ بجھے
اور آج کسے معلوم، ضمیر ہستی کا آہنگِ تپاں
کس دور کے دیس کے کہروں میں لرزاں لرزاں رقصاں رقصاں
اس سانس کی رو تک پہنچا ہے
اس میرے میز پہ جلتی ہوئی قندیل کی لو تک پہنچا ہے
کون آیا ہے؟ کون آتا ہے؟ کون آئے گا؟
انجانے من کی مورکھتا کو کیا کیا دھیان گزرتا ہے
دل ڈرتا ہے!
دل ڈرتا ہے ان کالی اکیلی راتوں سے دل ڈرتا ہے

غزل

ضمیر رازداں ہے اور میں ہوں
جہاں اندر جہاں ہے اور میں ہوں

درِ پیرِ مغاں ہے اور میں ہوں
وہی رطلِ گراں ہے اور میں ہوں

وہی دورِ زماں ہے اور میں ہوں
وہی رسمِ فغاں ہے اور میں ہوں

فریبِ رنگ و بو ہے اور تم ہو
بہارِ صد خزاں ہے اور میں ہوں

جہاں ہے۔ اور سکوتِ نیم شب ہے
مرا قلبِ تپاں ہے اور میں ہوں

یہ دو ساتھی نہ جانے کب بچھڑ جائیں
مری عمرِ رواں ہے اور میں ہوں

غزل

میں تڑپا کیا۔۔۔ اور گیسوئے ناز
سنورتے گئے۔۔۔ دن گزرتے گئے

میں روتا رہا۔۔۔ اور بہاروں کے رنگ
نکھرتے گئے۔۔۔ دن گزرتے گئے

مری زیست پر ان کے جلووں کے نقش
ابھرتے گئے۔۔۔ دن گزرتے گئے

گلستاں کے دامن میں کھل کھل کے پھول
بکھرتے گئے۔۔۔ دن گزرتے گئے

میں ان کے تصور میں کھویا رہا
گزرتے گئے دن۔۔۔ گزرتے گئے

چھلکتے ہوئے جام میں ماہ و سال
اترتے گئے۔۔۔ دن گزرتے گئے

غزل

عزمِ نظر نہیں۔ ہوسِ جستجو نہیں
کوئی بھی اب شریک غمِ آرزو نہیں

ہے اس چمن میں نالۂ صد عندلیب بھی
صرف ایک شور قافلۂ رنگ و بو نہیں

میرے نصیبِ شوق میں لکھا تھا یہ مقام
ہر سو ترے خیال کی دنیا ہے، تو نہیں

ہنستا ہوں پی کے ساغرِ زہرابِ زندگی
میں کیا کروں کہ مجھ کو تڑپنے کی خو نہیں

رودادِ زمانہ

مجھ کو تسلیم ہے یہ بات فسانہ ہی سہی
پھر بھی سوچو تو حقیقت ہے کہ اس دنیا میں
جب سے ویرانۂ ماضی کے اندھیروں میں کہیں،
رینگتے اژدروں کی زہر بھری پھنکاریں۔۔۔
نفسِ سینۂ انساں کی خبر لائی ہیں،
ہم نے دیکھا ہے یہی کچھ کہ ہر اک دورِ زماں
برف زاروں سے پھسلتی ہوئی صدیوں کا خروش
کھولتے لاوے میں جلتے ہوئے قرنوں کا دھواں،
نردبانِ سحر و شام کے ساتھ اٹھتی ہوئی
اس صنم خانۂ ایام کی اک اک تعمیر،
کچھ اگر ہے بھی، یہ سب سلسلۂ زیست تو ہے
انہی ناگوں کے خم و پیچ بدن کی تصویر!!۔۔
کیا وہ شوریدگیِ آب و دخاں کی منزل
کیا یہ حیرت کدۂ لالہ و گل کی سرحد

جا بجا وقت کے گنبد میں نظر آتے ہیں
یہی عفریت، خدایانِ جہاں کے اب وجد
زیبِ اورنگ کہیں، زینتِ محراب کہیں!!
ان کی شعلہ سی زباں ہے کہ ازل سے اب تک
چاٹتی آئی ہے ان کانپتی روحوں کا لہو
جن کے ہونٹوں کی ڈلک، جن کی نگاہوں کی چمک
زہر میں ڈوب کے بھی بجھ نہ سکی، بجھ نہ سکی

ہاں اسی طرح سرِ سطحِ سوادِ ایام!
بارہا جنبشِ یک موج کے ہلکورے میں
بہ گئے غولِ بیاباں کے گرانڈیل اجسام
بارہا تند ہوائیں چلیں طوفاں آئے
لیکن اک پھول سے چمٹی ہوئی تتلی نہ گری

کوئی سمجھے، تو حقیقت ہے، نہ سمجھے تو یہ بات
اک فسانہ سہی، رودادِ زمانہ نہ سہی

غزل

چمن چمن میں بہ طغیانِ رنگِ لالہ پھرو
ختن ختن میں بہ انبوہِ صد غزالہ پھرو

سجا کے ہونٹوں پہ اک جشنِ زہرِ خند چلو
چھپا کے سینے میں صد موجِ آہ و نالہ پھرو

روش روش پہ بچھی ہے سیاہیوں کی بساط
پلک پلک پہ جلا کر چراغِ لالہ پھرو

چکیدِ اشکِ فراواں سے ہے کشیدِ شراب
جہانِ قیصر و جم میں تہی پیالہ پھرو

کنارِ دل سے گزرتی اداس راہوں پر
ہر ایک سانس ہے عمرِ ہزار سالہ پھرو

کانٹے کلیاں

تم سے تو یہ ڈسنے والے کانٹے اچھے' ہنستے پھولو!
چنچل کانٹے' لانبی دوب کی ٹھنڈی چھاؤں کے متوالے'
اپنی جلتی جلتی زباں سے چاٹ چاٹ کے دکھتے چھالے'
ہر راہی کا دامن تھام کے کہتے ہیں
''او جانے والے!''
چلتے چلتے' جب تم اک دن پھاند کے' یہ گم سم ویرانہ
دور' کسی وادی کے کنارے' کھول کے اپنے دل کا خزانہ
ڈرتے ڈرتے' چھیڑو کوئی دھیما دھیما مست ترانہ
ہم نے ہی یہ بس میں گھول کے رس بخشا تھا' بھول نہ جانا''
تم سے تو یہ ڈسنے والے کانٹے اچھے' ہنستے پھولو!
ظالم پھولو! کتنے پیاسے خوابوں کے بیتاب ہیولے
کتنی زندگیوں کے بگولے' تمھاری خوشبوؤں کے جھولے
میں دو گھومتے لمحوں کے لب چوم کے اپنا رستہ بھولے
تم سے تو یہ کانٹے اچھے۔۔۔

غزل

ترے فرقِ ناز پہ تاج ہے، مرے دوشِ غم پہ گلیم ہے
تری داستاں بھی عظیم ہے، مری داستاں بھی عظیم ہے

مری کتنی سوچتی صبحوں کو یہ خیال زہر پلا گیا
کسی تپتے لمحے کی آہ ہے کہ خرامِ موجِ نسیم ہے

تہِ خاک، کرمکِ دانہ جو بھی شریکِ رقصِ حیات ہے
نہ بس ایک جلوۂ طور ہے، نہ بس ایک شوقِ کلیم ہے

یہ ہر ایک سمت مسافتوں میں گندھی پڑی ہیں جو ساعتیں
تری زندگی، مری زندگی، انہی موسموں کی شمیم ہے

کہیں محملوں کا غبار اڑے، کہیں منزلوں کے دیے جلیں
خمِ آسماں، رہِ کارواں! نہ مقام ہے، نہ مقیم ہے

حرم اور دیر فسانہ ہے، یہی جلتی سانس زمانہ ہے
یہی گوشۂ دلِ ناصبور ہی کنجِ باغِ نعیم ہے

منزل

اس ایک بات سے انکار ہو نہیں سکتا
کہ ہم نے اپنے لہو سے، بساطِ عالم پر
لکیر کھینچی ہے جس سلطنت کی، اس کا وجود
ہے ایشیا کے شبستاں میں، صبحِ نو کی نمود!

یہ سب بجا ہے، کہ ہم جن جگر کے ٹکڑوں کو
بہ شہر و قریہ، بہ دشت و چمن، بہ کوچہ و بام
بھڑکتی آگ میں بہتے لہو میں چھوڑ آئے
وہ روحیں، جن کے سیہ پوش، ماتمی سائے
ہمارے ہنستے ہوئے پیکروں سے لپٹے ہیں
وہ قافلے، کہ جنھیں مہلتِ سفر نہ ملی
انھی کے سڑتے ہوئے لوتھڑوں کی ہونکتی بو
انھی کی ڈوبتی فریادیں، چیختے آنسو
ہمارے محلوں کے نغمے، ہمارے باغوں کے پھول!

مگر یہ پھول' یہ نغمے' یہ نکہتوں کے ہجوم
سحر سحر کو اگر مشکبار کر نہ سکے
نفس نفس کو امینِ بہار کر نہ سکے
وہ جن کے واسطے یہ گلستاں سجایا گیا
گر اس طرح تہی داماں' تہی سبد ہی رہے
تو سوچ لو کہ یہ نازک' لطیف پرتوِ نور
یہ لڑکھڑاتی ہواؤں میں ٹھیرا غرور
ہزار ساعتِ بے برگ کے بیاباں میں
یہ اک امنگوں بھری سانس!

اس کا مستقبل؟

ہماری زندگیوں سے اک اک تڑپ لے کر
پروئے ہیں جو فلک نے' یہ سلکِ شام و سحر
گلوئے غم کے لیئے' چہرۂ طرب کے لیے
سدا بہار ارادوں کے ہار!

ان کا مآل؟

یہی سوال ہے رازِ غمِ زمان و زمیں!
حضور! اس کا جبیں پر شکن جواب نہیں

منٹو

میں نے اس کو دیکھا ہے
اجلی اجلی سڑکوں پر اک گرد بھری حیرانی میں
پھیلتی پھیلتی بھیڑ کے اندھے اوندھے کٹوروں کی طغیانی میں،
جب وہ خالی بوتل پھینک کے کہتا ہے:
''دنیا! تیرا حسن، یہی بدصورتی ہے۔''
دنیا اس کو گھورتی ہے
شورِ سلاسل بن کر گونجنے لگتا ہے
انگاروں بھری آنکھوں میں یہ تند سوال
کون ہے یہ جس نے اپنی بہکی بہکی سانسوں کا جال
بامِ زماں پر پھینکا ہے؟
کون ہے جو بل کھاتے ضمیروں کے پرپیچ دھندلکوں میں
روحوں کے عفریت کدوں کے زہر اندوز محلکوں میں
لے آیا ہے، یوں بن پوچھے، اپنے آپ
عینک کے برفیلے شیشوں سے چھنتی نظروں کی چاپ؟
کون ہے یہ گستاخ؟
تاخ، تڑاخ!

غزل

کوئی بھی دور سرِ محفلِ زمانہ رہا
تمھارا ذکر رہا یا مرا فسانہ رہا

مرے نشانِ قدم دشتِ غم پہ ثبت رہے
ابد کی لوح پہ تقدیر کا لکھا نہ رہا

وہ کوئی کنجِ سمن پوش تھا کہ تودۂ خس
اک آشیانہ بہرحال آشیانہ رہا

تم اک جزیرۂ دل میں سمٹ کے بیٹھ رہے
مری نگاہ میں طوفانِ صد زمانہ رہا

طلوعِ صبح کہاں ہم طلوع ہوتے گئے
ہمارا قافلہ بے درا روانہ رہا

یہ پیچ پیچ بھنور اس کی اک گرہ تو کھلی
کوئی تڑپتا سفینہ رہا رہا نہ رہا

نہ شاخِ گل پہ نشیمن نہ رازِ گل کی خبر
وہ کیا رہا جو جہاں میں قلندرانہ رہا

غزل

اس اپنی کرن کو آتی ہوئی صبحوں کے حوالے کرنا ہے
کانٹوں سے الجھ کر جینا ہے پھولوں سے لپٹ کر مرنا ہے

شاید وہ زمانہ لوٹ آئے، شاید وہ پلٹ کر دیکھ بھی لیں
ان اجڑی اجڑی نظروں میں پھر کوئی فسانہ بھرنا ہے

یہ سوزِ دروں، یہ اشکِ رواں، یہ کاوشِ ہستی کیا کہیے
مرتے ہیں کہ کچھ دن جی لیں ہم، جیتے ہیں کہ آخر مرنا ہے

اک شہرِ وفا کے بند دریچے آنکھیں میچے سوچتے ہیں
کب قافلہ ہائے خندۂ گل کو ان راہوں سے گزرنا ہے

اس نیلی دھند میں کتنے بجھتے زمانے راکھ بکھیر گئے
اک پل کی پلک پر دنیا ہے، کیا جینا ہے کیا مرنا ہے

رستوں پہ اندھیرے پھیل گئے، اک منزلِ غم تک شام ہوئی
اے ہمسفرو! کیا فیصلہ ہے اب چلنا ہے کہ ٹھہرنا ہے؟

ہر حال میں اک شوریدگیِ افسونِ تمنا باقی ہے
خوابوں کے بھنور میں بہہ کر بھی خوابوں کے گھاٹ اترنا ہے

افتاد

کوئی دوزخ کوئی ٹھکانا تو ہو
کوئی غم حاصلِ زمانہ تو ہو
لالہ و گل کی رت نہیں نہ سہی
کچھ نہ ہو، شاخِ آشیانہ تو ہو
کبھی لچکے بھی آسمان کی ڈھال
یہ حقیقت کبھی فسانہ تو ہو
ان اندھیروں میں روشنی کے لیے
طاقِ چوبیں پہ شمع خانہ تو ہو
کسی بدلی کی ڈولتی چھایا
کوئی رختِ مسافرانہ تو ہو
گونجتے گھومتے جہانوں میں
کوئی آوازِ محرمانہ تو ہو
اس گلی سے پلٹ کے کون آئے
ہاں مگر اس گلی میں جانا تو ہو
میں سمجھتا ہوں ان سہاروں کو
پھر بھی جینے کا اک بہانہ تو ہو

غزل

ایک ایک جھروکا خندہ بہ لب ایک ایک گلی کہرام
ہم لب سے لگا کر جام، ہوئے بدنام، بڑے بدنام

رت بدلی کہ صدیاں لوٹ آئیں، اف یاد کسی کی یاد
پھر سیلِ زماں میں تیر گیا اک نام، کسی کا نام

دل ہے کہ اک اجنبیٔ حیراں، تم ہو کہ پرایا دیس
نظروں کی کہانی بن نہ سکیں ہونٹوں پہ رکے پیغام

روندیں تو یہ کلیاں نیشِ بلا، چومیں تو یہ شعلے پھول
یہ غم یہ کسی کی دین بھی ہے، انعام عجب انعام

اے تیرگیوں کی گھومتی رو، کوئی تو رسیلی صبح
اے روشنیوں کی ڈولتی لو، اک شام، نشیلی شام

رہ رہ کے جیالے راہیوں کو دیتا ہے یہ کون آواز
کونین کی ہنستی منڈیروں پر، تم ہو کہ غمِ ایام

بے برگ شجر، گردوں کی طرف پھیلائیں ہمکتے ہات
پھولوں سے بھری ڈھلوان پہ سوکھے پات کریں بسرام

ہم فکر میں ہیں اس عالم کا دستور ہے کیا دستور
یہ کس کو خبر اس فکر کا ہے دستورِ دو عالم نام

غزل

دل نے ایک ایک دکھ سہا، تنہا
انجمن انجمن رہا، تنہا

ڈھلتے سایوں میں تیرے کوچے سے
کوئی گزرا ہے بارہا، تنہا

تیری آہٹ قدم قدم اور میں
اس معیت میں بھی رہا، تنہا

کہنہ یادوں کے برف زاروں سے
ایک آنسو بہا، بہا تنہا

ڈوبتے ساحلوں کے موڑ پہ دل
اک کھنڈر سا رہا سہا، تنہا

گونجتا رہ گیا خلاؤں میں
وقت کا ایک قہقہہ تنہا

نہ کوئی سلطنتِ غم ہے نہ اقلیمِ طرب

کیا کہوں، کتنے غموں، کتنے غموں کی شکن آلود بساط!
وقت کے گھومتے زینوں پہ مرے رکتے ہوئے قدموں کے سات
کس طرح بچھتی لپٹتی ہی چلی آئی ہے
کیا بتاؤں یہ کہانی بڑی طولانی ہے

یہ مرا قصۂ غم کون سنے؟ کس کو سناؤں؟ ۔۔ کس کو
اپنے احساس کا وہ جلتا ہوا زہر پلاؤں؟ ۔۔ جس کو
پیتے پیتے مری اک عمر کٹی ہے اک عمر

دیکھتے ہو وہ جو اک جادۂ نورانی ہے
وہ جو اک موڑ ہے اور وہ جو جھروکا ہے سرِ بامِ بلند
کبھی پہنچی نہیں جس تک سحر و شام کے سایوں کی کمند
وہ جو جھکتی ہوئی مڑتی ہوئی دیواریں ہیں
جن کا منصب انہی گلیوں کی نگہبانی ہے

وہ جو ہر شام انہی گلیوں میں کوئی مست سی لے
بند ہوتے ہوئے دروازوں کے آہنگ میں گھل جاتی ہے
وہ خموشی' سفرِ شب کے تسلسل کی نقیب
جس کی میت پہ اندھیروں نے ردا تانی ہے
میں نے اک عمر اسی معمورۂ ظلمات میں رقصاں' جولاں
ہر قدم اپنے ہی قدموں کی صداؤں سے گریزاں' لرزاں
جگرِ جام سے چھینے ہوئے نشوں میں مگن
خاک ان راہوں کی یوں خاک بہ سر چھانی ہے
جس طرح ایک سہارے کی تمنا میں کسی ٹوٹتے تارے کی حیات
مہ و انجم کے سفینوں کی طرف اپنے بڑھائے ہوئے ہات
خمِ افلاک سے ٹکرا کے بھسم ہو جائے
(ان خلاؤں میں کسے تابِ پر افشانی ہے!)
میں بھی پلکوں پہ امنگوں کے دیے لے کے گرجتے ہوئے طوفانوں میں
منتظر تھا کہ اچانک کہیں باغوں میں' بیابانوں میں
آ کے بس جائے کسی نغمۂ شیریں کی بہار!
یہ مرے گرد جو پھیلی ہوئی ویرانی ہے
کب یہاں ریزۂ صد ساغر بشکستہ سے کلیاں پھوٹیں

میں نہیں کہتا کہ کلیاں نہیں مہکیں مرے گلزاروں میں
مجھ کو یہ غم ہے وہ اک لمحۂ نایاب کہ جو
حاصلِ سلطنتِ عالمِ امکانی ہے
جب مری زیست سے ٹکرا کے بھسم ہو بھی گیا تب مجھے معلوم ہوا
تب میں سمجھا، کہ یہ راہیں، یہ گھروندے، یہ چھکتی دنیا
اب یہ سب کچھ غمِ جاوید کی اک دھڑکن ہے
اب یہی زخم ہیں اور شغلِ نمک رانی ہے

آج بھی جب کہیں رستے میں، کسی موڑ، کسی منزل پر
کسی دیوار سے کنکر بھی پھسل جاتا ہے
کوئی دامن کہ جسے نازِ گل افشانی ہے
دھوپ میں سوکھتی خرما کی چنگیروں سے بھرے کوٹھوں سے
ایک پل کے لیے اڑتا ہے سمٹتا ہے تو دھیرے دھیرے
کوئی لے سی مرے احساس میں بھر جاتی ہے
تارِ بربط کی کوئی لرزشِ پنہانی ہے
جو شب و روز کے ایواں میں فغاں بن کے بکھر جاتی ہے
آسمانوں سے، زمینوں سے کسی دل کے دھڑکنے کی صدا آتی ہے
کوئی چپکے سے مرے کان میں کہہ جاتا ہے
سنتے ہو، کس کی یہ آواز ہے، پہچانی ہے؟

"یوں کب تک صبح و شام جلیں
بے سود جلیں، ناکام جلیں
جب دنیا والے سو جائیں
میٹھے سپنوں میں کھو جائیں۔۔
جب چلتے دریا تھم جائیں
تاروں کی نگاہیں جم جائیں
جب آگ بجھے چوپالوں کی
جب آنکھ لگے رکھوالوں کی
دیوار و در سے چمٹتے ہوئے
سائے کی طرح سمٹتے ہوئے
دو بھک منگوں کے بھیس میں ہم
جا نکلیں اک اور دیس میں ہم
کچھ دور، افق کے پار، ادھر
ہے ایک نیا سنسار، ادھر
خوشیوں کی سنگاروں کی دنیا
پھولوں کی بہاروں کی دنیا"

آج اس فرصتِ یک گام کو روتا ہوں جب اک لغزشِ پا
چھین کر لے گئی مجھ سے وہ امنگوں سے چھلکتی دنیا

آہ وہ دنیا جسے کھو کے میں پھر پا نہ سکا
یوں تو آفاق میں دنیاؤں کی ارزانی ہے
ان خلاؤں میں ستارے بھی ہیں، خورشید بھی ہے، ماہ بھی ہے
کون جانے کہ زمانے کے سمندر کی کوئی تھاہ بھی ہے
لیکن اک دنیا جسے کھو کے میں پھر پا نہ سکا
جس کے ماتم میں مری چاک گریبانی ہے
میری سم خوردہ تمناؤں کی نظروں سے گریزاں ہی رہی
لاکھ ڈھونڈھا، مگر افسوس کہ اک رنجِ پشیماں نکہی
بوجھ بن کر مری تقدیر کی پلکوں پہ رہا
اب مرا دل ہے کہ اک عالمِ حیرانی ہے
اب یہ دنیا، یہ صدا کوش نصیبوں سے بھرے شہر و دیار
غموں خوشیوں کے جھمیلوں میں نہاتی ہوئی روحوں کا نکھار
مجھ سے پوچھو تو مرے سامنے اب یہ دنیا
ورقِ مصحفِ اندوہِ گراں جانی ہے
سوچتا ہوں یہی دو گھونٹ جو میں نے خمِ دوراں سے پیے
یہی دو سانس، شبستانِ ابد میں یہی دو بجھتے دیے
دوش و فردا کی فصیلوں میں یہی دو رخنے
یہی جو سلسلۂ زندگیٔ فانی ہے

کیا اسی ساعتِ محرومیِ غم تاب کی خاطر میں نے
وسعتِ وادیٔ ایام میں کانٹوں کے قدم چومے تھے؟
لاکھوں دنیاؤں کے لٹتے ہوئے کھلیانوں سے
میرا حصہ یہی میری تہی دامانی ہے؟
کیا اسی واسطے ماضی کے بختستانوں سے اک موجِ حیات
اپنے ہمراہ لیے ناچتی گاتی ہوئی صدیوں کی برات
آ کے اس ساحلِ گل پوش سے ٹکرائی ہے؟
کیا یہی مقصدِ صد عالمِ امکانی ہے
کہ جب اس سطحِ خروشندہ پہ ڈھونڈھوں میں کوئی رختِ طرب
کوئی مکھ، کوئی نگہ، کوئی تبسم، کوئی جینے کا سبب
آسمانوں سے صدا آئے ''تو کیا ڈھونڈتا ہے
تیرا ساماں تو یہی بے سروسامانی ہے''
عقل حیران ہے، یہ طرفہ حجاباتِ حریمِ اسرار
عقدۂ راحت و غم، رازِ جہانِ گل و خار
پا بہ زنجیر ارادوں کا خروشِ پیہم
یہی مستقبلِ معمورۂ انسانی ہے؟
کس کی فتراک میں ہیں عرشِ بریں فرشِ زمیں؟ کون کہے
پسِ صد پردۂ افلاک کوئی ہے کہ نہیں؟ کون کہے

جانے کن گہرے دھندلکھوں سے ضیا پاتی ہے
درحقیقت یہ حقیقت کی جوتابانی ہے
اتنے زخموں سے سجا کر دلِ بے تاب کی پژمردہ جبیں
کس نے بھیجا ہمیں اس جلتے ہوئے دیس میں؟ معلوم نہیں!
یوں نہ اپنے دمِ امید کو بہلائے کوئی'
کون کہتا ہے گلستاں میں بہار آنی ہے

جی میں آئی ہے کہ اک بارِ غمِ زیست پہ احساں دھر کر
دیگِ گردوں میں ابلتے ہوئے زہراب سے اک خم بھر کر
۔۔۔دیگِ گردوں کہ ابد زنگ شکم میں جس کے
کھولتے دردوں کا ہنگامۂ لافانی ہے۔۔۔
اسی زہراب سے خم بھر کے پٹخ دوں افقِ دوراں پر
آگ ہی آگ برسنے لگے اس پھولوں بھرے بستاں پر

اب یہی دھن ہے کہ اس ظلمتِ بے پایاں کو
جو مری روح کے ایوان کی زندانی ہے
اٹھ کے پھیلا دوں انہی اونچے درختوں سے ڈھکی راہوں پر
انہی گدرائی ہوئی دھوپ میں لہراتی چراگاہوں پر

اب ارادہ ہے کہ ان بس بھرے ارمانوں کو
جن کے سایوں میں مری زیست کی ویرانی ہے
گھول دوں جھومتے جھونکوں کو چھلکتے ہوئے پیمانوں میں
سینۂ دشت پہ بجتی ہوئی شہنائیوں کی تانوں میں

چاہتا ہوں کہ یہ زیتون کے جنگل کا سکوت
جس کی وسعت ہے کہ اک عالمِ حیرانی ہے
میری کھوئی ہوئی دنیاؤں کے کہرام سے تھرا اٹھے

اب یہ ٹھانی ہے کہ جمتی ہوئی بوندوں کے یہ بیکل چھینٹے
تیز جھالوں کے یہ چابک ــ کہ جن کی زد پر
کبڑے رستوں کی تھکی پیٹھ کی عریانی ہے
یہ دھواں دھوپ ترائی' یہ دھواں دھار پہاڑوں کی فصیل
دور تک چوٹیوں اور بدلیوں کے دیس کی سرحدِ جمیل
برف سی بدلیاں' جن کے لب تر سے پیوست
برف کی چوٹیوں کی دھودھیا پیشانی ہے
ہاں یہ سب سلسلۂ رنگ' یہ گہوارۂ حسن و افسوں
میں اسے اپنی دکھی روح کی ان راگنیوں سے بھر دوں

جن کی لہریں کبھی آنسو ہیں، کبھی آہیں ہیں
جن کی تقدیر کبھی آگ کبھی پانی ہے

کوئی غایت، کوئی منزل، کوئی حاصل سفرِ ہستی کا
کوئی مقصود بلندی کا کہ مفہوم کوئی پستی کا؟
کوئی مشعل بھی نہیں کوئی کرن بھی تو نہیں
شب اندھیری ہے، گھٹا ٹوپ ہے، طوفانی ہے
بولو اے نغمہ سرایانِ تحیر کدۂ کاہکشاں
میں کہاں جاؤں، کہاں جاؤں، کہاں جاؤں، کہاں؟

نغمۂ کواکب:

دائموس:

ناچ ناچ جھوم جھوم
گھوم گھوم گھوم گھوم
دیکھنا ادھر ضرور اک نظر
ناچتا ہے نزد و دور بے خبر
دامنِ نگار نور تھام کر

کہکشاں کے موڑ پر — فاصلوں کا اک ہجوم
ناچ ناچ — گھوم گھوم
وسعتِ ابد پناہ — اک ترنگ
عالمِ شبِ سیاہ — اک امنگ
منزلیں، نشانِ راہ — سحر رنگ
شعلہ شعلہ انگ انگ — آگ آگ روم روم
گھوم گھوم — گھوم گھوم

فیپوس:

دیے جلتے رہے دیے جلتے رہے
گھم گھم اُمڈے دھوئیں کے دل
جگ جگ پھیل گئے کاجل
دم دم، دھم دھم، گرے محل
مٹی ہوئی صدیوں میں پل
ڈھلتے رہے
دیے جلتے رہے!

کتنے زمانے، کتنے سپن
توڑ گئے اپنے درپن
نیر بہاتے رہے نین
وقت کے جھکڑ گگن گگن

چلتے رہے
دیے جلتے رہے!

اندھیاروں کے زہر پیے
آنکھوں کو گل رنگ کیے
امر اجالے لو میں لیے
جیون کی منڈلی میں دیے

چلتے رہے
دیے جلتے رہے!

ارناوس:

کوئی ساحل ہے نہ کنارا
اک پھیلتا بڑھتا دھارا
بہے نگر نگر

مری نوکا، بھنور بھنور

ہر آن رتوں کا میلہ
ہر سمت سمے کا ریلا
چلے گھمر گھمر

مری نو کا بھنور بھنور

بوجھا تنے ہیں کڑیل جن کے
یہ دکھ سکھ بہتے تنکے
گریں ابھر ابھر

مری نو کا بھنور بھنور

کہتی ہوئی من کی بانی
تقدیر جہاں کی رانی
پھرے سنور سنور

مری نو کا بھنور بھنور

پلوطو:

کتنی اندھیری رات ہے چمکو۔ چمکو
شام و سحر کی اوٹ سے ہر دم
پیہم
گھور رہے ہی طوفاں ہم کو، چمکو

دیکھو، تیرگیوں کے فتنے،
کتنے،
روند چلے عالم عالم کو، چمکو
سکھ میں سمو لو اک اک پل کو
جھلکو
من میں بجھا لو شعلۂ غم کو، چمکو

آتے ہوئے قرنوں کا تبسم
ہم تم
جگ مگ دمکو، جھم جھم جھمکو، چمکو
کتنی اندھیری رات ہے چمکو۔ چمکو

کرہ ارض:

نہ عکسِ خاک کہیں اور نہ رقصِ نور کہیں
نہ کوئی وادیٔ ایمن نہ شمعِ طور کہیں
بجھی ہے راکھ میں غلطاں مئے طہور کہیں
پڑا ہے شیشۂ افلاک چور چور کہیں

پلوں کے جھنڈ میں لرزے ابد کی پینگ کوئی
نظر کے سامنے، حدِ نظر سے دور کہیں
مقدروں کے جہاں در جہاں اندھیروں میں
بھٹک نہ جائے مرا شوقِ ناصبور کہیں
یہ اضطرابِ مسلسل کی خوں چکاں گھڑیاں
ہے ان سے بڑھ کے کوئی دولتِ سرور کہیں
اگر ہمیں بھری دنیا میں مسکرا نہ سکے
تو ڈول جائیں گے یہ سلسلے ضرور کہیں

شہر در شہر منادی ہے کہ
"اے خندہ فروشانِ حیات
ہر کبھی روح کے آنگن میں کھلا ہے چمنِ امکانات
نہ کوئی سلطنتِ غم ہے نہ اقلیم طرب!
زندگی ہی فقط آئینِ جہاں بانی ہے!
جانے کس تیرہ افق سے یہ گھٹاؤں کے تھرکتے سائے
ماہتابوں کے چمکتے ہوئے سینوں سے نتھر کر آئے
ساتھ لے کر وہ خنک موج، خماریں جھونکے
جن کی زد میں مری تپتی ہوئی پیشانی ہے!

اپنے سینے میں جگا کر انہی دردوں، انہی یادوں کے فسوں
پھر تمناؤں کے تصویر کدے میں نگراں بیٹھا ہوں
سامنے صفحۂ صد رنگِ رموزِ کونین
کانپتی انگلیوں میں موقلم مانی ہے!

بس سٹینڈ پر

''خدایا اب کے یہ کیسی بہار آئی''

''خدا سے کیا گلہ' بھائی!
خدا تو خیر کس نے اس کا عکسِ نقشِ پا دیکھا
نہ دیکھا تو بھی دیکھا اور دیکھا بھی تو کیا دیکھا
مگر توبہ' مری توبہ' یہ انساں بھی تو آخر اک تماشا ہے
یہ جس نے پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہونا بڑے جتنوں سے سیکھا ہے
ابھی کل تک' جب اس کے ابروؤں تک موئے پیچاں تھے
ابھی کل تک' جب اس کے ہونٹ محرومِ زنخداں تھے
ردائے صد زماں اوڑھے' لرزتا' کانپتا' بیٹھا
ضمیرِ سنگ سے بس ایک چنگاری کا طالب تھا!''

''مگر اب تو یہ اونچی ممٹیوں والے جلوخانوں میں بستا ہے
ہمارے ہی لبوں سے مسکراہٹ چھین کر اب ہم پہ ہنستا ہے
خدا اس کا خدائی اس کی' ہر شے اس کی' ہم کیا ہیں!
چمکتی موٹروں سے اڑنے والی دھول کا ناچیز ذرہ ہیں''

''ہماری ہی طرح جو پائمالِ سطوتِ میری و شاہی ہیں
لکھوکھا' آبدیدہ' پاپیادہ' دل زدہ' واماندہ راہی ہیں
جنھیں نظروں سے گم ہوتے ہوئے رستوں کی غم پیما لکیروں میں
دکھائی دے رہی ہیں آنے والی منزلوں کی دھندلی تصویریں''

''ضرور اک روز بدلے گا نظامِ قسمتِ آدم
بسے گی اک نئی دنیا' سجے گا اک نیا عالم
شبستاں میں نئی شمعیں' گلستاں میں نیا موسم''

''وہ رت اے ہم نفس جانے کب آئے گی
وہ فصلِ دیر رس جانے کب آئے گی
یہ نو نمبر کی بس جانے کب آئے گی''

آٹوگراف

کھلاڑیوں کے خودنوشت دستخط کے واسطے
کتابچے لیے ہوئے
کھڑی ہیں منتظر۔۔ حسین لڑکیاں!
ڈھلکتے آنچلوں سے بے خبر، حسین لڑکیاں!

مہیب پھاٹکوں کے ڈولتے کواڑ چیخ اٹھے
ابل پڑے الجھتے بازوؤں، چٹختی پسلیوں کے پر ہراس قافلے
گرے، بڑھے، مڑے بھنور ہجوم کے

کھڑی ہیں یہ بھی، راستے پہ، اک طرف،
بیاضِ آرزو بہ کف
نظر نظر میں نارسا پرستشوں کی داستاں
لرز رہا ہے دم بہ دم
کمانِ ابرواں کا خم

کوئی جب ایک نازِ بے نیاز سے
کتابچوں پہ کھینچتا چلا گیا
حروفِ کج تراش کی لکیر سی
تو تھم گئیں لبوں پہ مسکراہٹیں شریر سی

کسی عظیم شخصیت کی تمکنت
حنائی انگلیوں میں کانپتے ورق پہ جھک گئی
تو زرنگار پلّوؤں سے جھانکتی کلائیوں کی تیز نبض رک گئی!

وہ باؤلر' ایک مہ وشوں کے جمگھٹوں میں گھر گیا
وہ صفحۂ بیاض پر بصد غرور کلکِ گوہریں پھری
حسین کھلکھلاہٹوں کے درمیان وکٹ گری

میں اجنبی' میں بے نشاں
میں پابہ گِل!
نہ رفعتِ مقام ہے' نہ شہرتِ دوام ہے
یہ لوحِ دل! یہ لوحِ دل!
نہ اس پہ کوئی نقش ہے' نہ اس پہ کوئی نام ہے!

غزل

روش روش پہ ہیں نکہت فشاں گلاب کے پھول
حسیں گلاب کے پھول' ارغواں گلاب کے پھول

افق افق پہ زمانوں کی دھند سے ابھرے
طیور' نغمے' ندی' تتلیاں' گلاب کے پھول

کس انہماک سے بیٹھی کشید کرتی ہے
عروسِ گل بہ قبائے جہاں' گلاب کے پھول

جہانِ گریۂ شبنم سے' کس غرور کے سات
گزر رہے ہیں' تبسم کناں' گلاب کے پھول

کسی کا پھول سا چہرہ اور اس پہ رنگ افروز
گندھے ہوئے بہ خمِ گیسواں' گلاب کے پھول

خیالِ یار، ترے سلسلے نشوں کی رتیں
جمالِ یار، تری جھلکیاں گلاب کے پھول

مری نگاہ میں دورِ زماں کی ہر کروٹ
لہو کی لہر، دلوں کا دھواں گلاب کے پھول

سلگتے جاتے ہیں، چپ چاپ ہنستے جاتے ہیں
مثالِ چہرۂ پیغمبراں، گلاب کے پھول

یہ کیا طلسم ہے، یہ کس کی یاسمیں باہیں
چھڑک گئی ہیں جہاں در جہاں گلاب کے پھول

کٹی ہے عمر بہاروں کے سوگ میں امجد
مری لحد پہ کھلیں جاوداں گلاب کے پھول

غزل

اک وہ کہ جن کی فکر ہے ارض و سما شکار
اک تو کہ ہے طلسمِ شب و روز کا شکار

لاؤ کہیں سے کوئی ضمیرِ فرشتہ صید
ڈھونڈو کہیں سے کوئی نگاہِ خدا شکار

اس انجمن میں دیکھئے اہلِ وفا کے ظرف
کوئی ادا شناس ہے کوئی ادا شکار

آتا ہے خود ہی چوٹ پہ صیدِ سبک مراد
ہوتا ہے ورنہ کون زکارِ قضا شکار

ظلِ ہما کی اوٹ میں چلّے پہ تیر رکھ
آساں نہیں نگاہ کے نخچیر کا شکار

جولاں گہِ حیات انہی کی ہے دوستو
فتراک میں ہے جن کے دلِ مدعا شکار

مقبرہ جہانگیر

زنگ آلود کمر بند، صدف دوز عبا،
یہ محافظ، تہ محراب عصا تھامے ہوئے
کھانستی صدیوں کا تھوکا ہوا اک قصہ ہیں
اسی گرتی ہوئی دیوار کا اک حصہ ہیں!

کھردرے، میلے، پھٹے کپڑوں میں بوڑھے مالی
یہ چمن بند، جو گزرے ہوئے سلطانوں کی
ہڈیاں سینچ کے پھلواڑیاں مہکاتے ہیں
گھاس کٹتی ہے کہ دن ان کے کٹے جاتے ہیں

اور انھیں دیکھو۔ یہ جاروب کشان بے عقل
صبح ہوتے ہی جو چن چن کے اٹھا پھینکتے ہیں
گٹھلیاں۔ عشرت دز دیدہ کی تلچھٹ سے بھری
کہنہ زینوں میں پڑی، تیرہ دریچوں میں پڑی!

لاکھ ادوار کی لاشوں پہ بچھا کر قالین
چند لوگ اپنی ترنگوں میں مگن بیٹھے ہیں
عکس پڑتا ہے جو نظروں پہ حسیں زلفوں کا
ڈوب جاتا ہے پیالوں میں دھواں سلفوں کا

سنگِ احمر کی سلوں پر یہ سطورِ پر نور
جن کی ہر جدولِ گل پیچ کے الجھاؤ میں
کتنے صناعوں کی صد عمرِ عزیز آویزاں
اس جگہ آج سحر خیز' مریض آویزاں

موجِ صد نقش میں لپٹے ہوئے میناروں کے
دودھیا برج' درختوں کے گھنے جھنڈ میں گم
جن کے چھجوں سے نظر آتے ہیں مدفونِ غبار
رینگتی روحوں سے آباد گناہوں کے دیار!

گنبدِ دل میں لیے رقصِ مہ و سال کی گونج
یہ جھروکا کہ جو راوی کی طرف کھلتا ہے
اپنی تنہائی ویراں سے اماں مانگتا ہے
ہر گزرتی ہوئی گاڑی سے دھواں مانگتا ہے!

تین سو سال سے مبہوت کھڑے ہیں جو یہ سرو
ان کی شاخیں ہیں کہ آفاق کے شیرازے ہیں
صف ایام کی بکھری ہوئی ترتیبیں ہیں
ان کے سائے میں کہ ڈھلتی ہوئی تہذیبیں ہیں

مرمریں قبر کے باہر چمن و قصر و اطاق'
کوئلیں' امریاں' جھونکے' روشیں' فوارے
اور۔۔۔ کچھ لوگ کہ جو محرم آداب نہیں!

مرمریں قبر کے اندر' تہ ظلمات کہیں
کرمکؔ و مور کے جبڑوں میں سلاطیں کے بدن
کوئی دیکھے' کوئی سمجھے تو اس ایواں میں جہاں
نور ہے' حسن ہے' تزئین ہے' زیبائش ہے
ہے تو بس ایک دکھی روح کی گنجائش ہے

تم نے دیکھا کہ نہیں آج بھی ان محلوں میں
قہقہے جشن مناتے ہوئے نادانوں کے
جب کسی ٹوٹتی محراب سے ٹکراتے ہیں
مرقدِ شاہ کے مینار لرز جاتے ہیں!

کہانی ایک ملک کی

(۱)

راج محل کے دروازے پر
آ کے رکی اک کار
پہلے نکلا بھدا' بے ڈھب' بودا'
میل کچیل کا تودا
حقہ تھامے اک میراثی'
عمر اس کی کوئی اسّی بیاسی
پیچھے اس کا نائب' تمباکو بردار'
باہر رینگے اس کے بعد قطار' قطار'
عنبر بار
نمبردار
ساتھ سب ان کے دم چھلے
ایم اَیلے

(۲)

راج محل کے اندر اک اک رتناسن پر
کوڑھی جسم اور نوری جامے

روگی ذہن اور گردوں پیچ عمامے
جہل بھرے علامے
ماجھے' گامے'
بیٹھے ہیں اپنی مٹھی میں تھامے
ہم مظلوموں کی تقدیروں کے ہنگامے
جیبھ پہ شہد۔ اور جیب میں چاقو
نسل ہلاکو!

(۳)

راج محل کے باہر' سوچ میں ڈوبے شہر اور گاؤں
ہل کی انی' فولاد کے پنجے'
گھومتے پہیے' کڑیل باہیں
کتنے لوگ' کہ جن کی روحوں کو سندیسے بھیجیں'
سکھ کی سیجیں
لیکن جو ہر راحت کو ٹھکرائیں
آگ پئیں اور پھول کھلائیں

غزل

وہ شے جو ایک نئے دور کی بشارت ہے
ترے لہو کی تڑپتی ہوئی حرارت ہے

نظامِ کہنہ کے سائے میں عافیت سے نہ بیٹھ
نظام کہنہ تو گرتی ہوئی عمارت ہے

وطن چمکتے ہوئے کنکروں کا نام نہیں
یہ تیرے جسم تری روح سے عبارت ہے

یہ کہہ رہی ہے صدا ٹوٹتے سلاسل کی
کہ زندگی تو فقط اک حسیں جسارت ہے

یہ اک جھلک ہے بدلتے ہوئے زمانوں کی
جبیں جبیں پہ شکن بھی کوئی بجھارت ہے

چمن میں اہلِ چمن کے یہ طور، ارے توبہ
کلی کلی کی ہنسی خندۂ حقارت ہے

دلوں کی جھونپڑیوں میں بھی روشنی اترے
جو یوں نہیں تو یہ سب سیلِ نور اکارت ہے

غزل

دل کٹ رہے ہیں کش مکشِ روزگار میں
دم گھٹ رہا ہے سایۂ ابرِ بہار میں

آتی ہے اپنے جسم کے جلنے کی بو مجھے
لٹتے ہیں نکہتوں کے سبو جب بہار میں

گزرا ادھر سے جب کوئی جھونکا تو چونک کر
دل نے کہا: "یہ آ گئے ہم کس دیار میں"

اے کنجِ عافیت تجھے پا کر پتہ چلا
کیا ہمہمے تھے گردِ سرِ رہگزار میں

میں ایک پل کے رنجِ فراواں میں کھو گیا
مرجھا گئے زمانے مرے انتظار میں

غزل

امیدِ دیدِ دوست کی دنیا بسا کے ہم
بیٹھے ہیں مہر و ماہ کی شمعیں بجھا کے ہم

وہ راستے خبر نہیں کس سمت کھو گئے
نکلے تھے جن پہ رختِ غمِ دل اٹھا کے ہم

پلکوں سے جن کو جلتے زمانوں نے چن لیا
وہ پھول، اس روش پہ، ترے نقشِ پا کے ہم

آئے کبھی تو پھر وہی صبحِ طرب کہ جب
روٹھے ہوئے غموں سے ملیں مسکرا کے ہم

کس کو خبر کہ ڈوبتے لمحوں سے کس طرح
ابھرے ہیں یادِ یار، تری چوٹ کھا کے ہم

غزل

دل سے ہر گزری بات گزری ہے
کس قیامت کی رات گزری ہے

چاندنی۔ نیم وا دریچہ۔ سکوت
آنکھوں آنکھوں میں رات گزری ہے

ہائے وہ لوگ' خوبصورت لوگ
جن کی دھن میں حیات گزری ہے

کسی بھٹکے ہوئے خیال کی موج
کتنی یادوں کے سات گزری ہے

تمتماتا ہے چہرۂ ایام
دل پہ کیا واردات گزری ہے

پھر کوئی آس لڑکھڑائی ہے
کہ نسیمِ حیات گزری ہے

بجھتے جاتے ہیں دکھتی پلکوں پہ دیپ
نیند آئی ہے، رات گزری ہے

پیش رَو

پت جھڑ کی اداس سلطنت
اک شاخِ برہنہ تن پہ تنہا
بے برگ مسافتوں میں حیراں
کچھ زود شگفت شوخ کلیاں
جو ایک سرورِ سرکشی میں
اعلانِ بہار سے بھی پہلے
انجامِ خزاں پہ ہنس پڑی ہیں
تقدیرِ چمن بنی کھڑی ہیں!

اس یخ کدۂ یقینِ غم میں
دیکھو یہ شگفتہ دل شگوفے
ماحول نہ کائنات ان کی
اک نازِ نمو حیات ان کی

عمر ان کی بس ایک پل ہے لیکن
آئیں گے، انھی کی راکھ سے، کل
ماتھے پہ حسیں تلک لگائے
پھولوں بھری صبحِ نو کے سائے!

غزل

قریبِ دل، خروشِ صد جہاں ہم
جو تم سن لو، تمھاری داستاں ہم

کسی کو چاہنے کی چاہ میں گم
جئے بن کر نگاہِ تشنگاں ہم

ہر اک ٹھوکر کی زد میں لاکھ منزل
ہمیں ڈھونڈھو، نصیبِ گمرہاں ہم

ہمیں سمجھو، نگاہِ ناز والو!
لبوں پر کانپتا حرفِ بیاں ہم

بجھی شمعوں کی اس نگری میں، امجدؔ
ابھرتے آفتابوں کی کماں ہم

پکار

کالی چونچ اور نیلے پیلے پنکھوں والی
چوں چوں، چُر چُر، چہکی "لالی"
بیٹھے بیٹھے، اڑ کر
اڑتے اڑتے، مڑ کر
بجلی کے اک تار پہ آ کر بیٹھ گئی ہے
موت کا جھولا جھول رہی ہے

میرے دل سے چیخ اک ابھری، میں للکارا
(جیسے کوئی بجے نقارا)
میری صدا پر بامِ اجل سے کندے تول کے اڑ گئی "لالی"
نیلے پیلے پنکھوں والی

اور اک تم ہو
انگاروں پر بیٹھے ہو اور پھولوں کے سپنوں میں گم ہو
میرے دل کی اک اک چیخ تمھیں بے سود پکارے

میونخ

آج کرسمس ہے
شہرِ میونخ میں آج کرسمس ہے

رود بارِ عسار کے پل پر
جس جگہ برف کی سلوں کی سڑک
فان کاچے کی سمت مڑتی ہے
قافلے قہقہوں کے اترے ہیں
آج اس قریۂ شراب کے لوگ
جن کے رخ پر ہزیمتوں کا عرق
جن کے دل میں جراحتوں کی خراش
ایک عزمِ نشاطِ جو کے ساتھ
امڈ آئے ہیں مست راہوں پر
باہیں باہوں میں، ہونٹ ہونٹوں پر!

برف گرتی ہے ساز بجتے ہیں
کوئے میریں کے اک گھروندے میں
ایک بوڑھی، اداس، ماں کے لیے
پھول اک طاقچے پہ ہنستے ہیں
گرم انگیٹھی کے عکسِ لرزاں سے
آگ اک آئنے میں جلتی ہے!
ایک دستک ہے! کون آیا ہے!
زرد کمرے کے گوشے گوشے میں
جورِ ماضی کا سایۂ مصلوب
آخری سانس لینے لگتا ہے!

ماں کے چہرے کی ہر عمیق شکن
ایک حیران مسکراہٹ کے
دلنشیں زاویوں میں ڈھلتی ہے
''میری شالاط، اے مری شالاط
اے میں قرباں، تم آ گئیں، بیٹی!''
اور وہ دُختِ ارضِ الماں جب

سر سے گٹھڑی اتار کر جھک کر

اپنی امی کے پاؤں پڑتی ہے
اس کی پلکوں پہ ملک ملک کی گرد
ایک آنسو میں ڈوب جاتی ہے

ایک مفتوح قوم کی بیٹی
پارۂ ناں کے واسطے تنہا
روئے عالم کی خاک چھان آئی

دس برس کے طویل عرصے کے بعد
آج وہ اپنے ساتھ کیا لائی؟
روح میں، دیس دیس کے موسم!

بزمِ دوراں سے کیا ملا اس کو
سیپ کی چوڑیاں، ملایا سے
کینچلی چین کے اک اژدر کی
ٹھیکری اک مہنجوداڑو کی

ایک نازک بیاض پر، مرا نام
کون سمجھے گا، اس پہیلی کو؟

فاصلوں کی کمند سے آزاد
میرا دل ہے کہ شہرِ میونخ ہے
چار سو، جس طرف کوئی دیکھے
برف گرتی ہے، ساز بجتے ہیں

غزل

اک شوقِ بے اماں کے یہ نخچیر کون ہیں
اے موجۂ ہوا' تہِ زنجیر کون ہیں

دیوار دل کے ساتھ بہ پیکانِ غم گڑے
آ دیکھ یہ ترے ہدفِ تیر کون ہیں

یہ بدلیوں کا شور' یہ گھنگھور قربتیں
بارش میں بھیگتے یہ دو رہگیر کون ہیں

ان ریزہ ریزہ آئنوں کے روپ میں بتا
صدیوں کے طاق پر' فلکِ پیر' کون ہیں

جن کی پلک پلک پہ ترے بام و در کے دیپ
پہچان تو سہی کہ یہ دلگیر کون ہیں

امجدؔ دیارِ لعل و گہر میں کسے خبر'
وہ جن کی خاکِ پا بھی ہے اکسیر کون ہیں

شناور

تیرتا ہے جب تیراک مرگِ رقص دھارے پر
موج سے ابھرتا ہے موج کے سہارے پر
موج پر مسلط بھی، موج کے حوالے بھی،
موج اسے اچھالے بھی موج اسے سنبھالے بھی
کینۂ تلاطم بھی ہم عنانِ دریا ہے
سینۂ شناور بھی درمیان دریا ہے
لاکھ لاکھ طوفاں ہیں ایک ایک قطرے میں
تیرنے کی شکتی ہے ڈوبنے کے خطرے میں

جو بہ جو تھپیڑے ہیں آتشیں خیالوں کے
تیرتے ہیں دل جن میں پیار کرنے والوں کے
پریمیوں کی باہوں میں چاہتوں کا دریا ہے
تیرنے کی قدغن ہے، ڈوبنے کا کھٹکا ہے

لہر لہر کی دھڑکن' درد کا قرینہ بھی
لہر لہر کی کروٹ' زندگی کا زینہ بھی
کتنے دل جو موجوں کی چوٹ چوٹ سہتے ہیں
اس بھنور کے گھیرے میں پھول بن کے بہتے ہیں

ترجمہ از (رابرٹ فرانس)

توسیع شہر

بیس برس سے کھڑے تھے جو اس گاتی نہر کے دوار
جھومتے کھیتوں کی سرحد پر‘ بانکے پہرے دار
گھنے‘ سہانے‘ چھاؤں چھڑکتے‘ بور لدے چھتنار
بیس ہزار میں بک گئے سارے ہرے بھرے اشجار

جن کی سانس کا ہر جھونکا تھا ایک عجیب طلسم
قاتل تیشے چیر گئے ان ساونتوں کے جسم

گری دھڑام سے گھائل پیڑوں کی نیلی دیوار
کٹتے ہیکل‘ جھڑتے پنجر‘ چھٹتے برگ و بار
سہمی دھوپ کے زرد کفن میں لاشوں کے انبار

آج کھڑا میں سوچتا ہوں اس گاتی نہر کے دوار‘
اس مقتل میں صرف اک میری سوچ‘ لہکتی ڈال
مجھ پر بھی اب کاری ضرب اک‘ اے آدم کی آل‘

عیدالاضحیٰ

ہزار جشنِ مسرت ترے گلستاں میں
ہزار رنگِ طرب' تیرے روئے خنداں پر
جھکی ہے شوکتِ کونین تیرے قدموں میں
پڑا ہے سایہ ترا اوجِ سربلنداں پر
تری حیات کا مسلک' ترے عمل کا طریق
اساس اس کی ہے کیشِ وفا پسنداں پر
تجھے عزیز تو ہے سنتِ براہیمی
تری چھری تو ہے حلقوم گوسفنداں پر
مگر کبھی تجھے اس بات کا خیال آیا
تری نگاہ نہیں دردِ دردمنداں پر

غزل

گھرے سروں ہیں عرضِ نوائے حیات کر
سینے پہ ایک درد کی سل رکھ کے بات کر

یہ دوریوں کا سیلِ رواں، برگِ نامہ بھیج
یہ فاصلوں کے بندِ گراں، کوئی بات کر

تیرا دیار، رات، مری بانسری کی لے
اس خوابِ دل نشیں کو مری کائنات کر

میرے غموں کو اپنے خیالوں میں بار دے
ان الجھنوں کو سلسلۂ واقعات کر!

آ، ایک دن، مرے دلِ ویراں میں بیٹھ کر
اس دشت کے سکوتِ سخن جو سے بات کر

امجد، نشاطِ زیست اسی کشمکش میں ہے
مرنے کا قصد، جینے کا عزم، ایک سات کر!

غزل

اک عمر دل کی گھات سے تجھ پر نگاہ کی
تجھ پر۔۔ تری نگاہ سے چھپ کر نگاہ کی

روحوں میں جلتی آگ خیالوں میں کھلتے پھول
ساری صداقتیں کسی کافر نگاہ کی

جب بھی غمِ زمانہ سے آنکھیں ہوئیں دو چار
منہ پھیر کر تبسمِ دل پر نگاہ کی!

باگیں کھنچیں، مسافتیں کڑکیں، فرس رکے
ماضی کی رتھ سے کس نے پلٹ کر نگاہ کی

دونوں کا ربط ہے تری موجِ خرام سے
لغزش خیال کی ہو کہ ٹھوکر نگاہ کی

بول انمول

اب یہ مسافت کیسے طے ہو' اے دل' تو ہی بتا
گھٹتی عمر اور گھٹتے فاصلے' پھر بھی وہی صحرا

چیت آیا' چیتاونی بھیجی' اپنا وچن نبھا'
پت جھڑ آئی' پتر لکھے۔۔ ''آ' جیون بیت چلا''

خوشیوں کا مکھ چوم کے دیکھا'' دنیا مان بھری!
دکھ وہ سجن کٹھور کہ جس کو روح کرے سجدا!

اپنا پیکر' اپنا سایہ' کالے کوس کٹھن'
دوری کی جب سنگت ٹوٹی' کوئی قریب نہ تھا

شیشے کی دیوار زمانہ' آمنے سامنے ہم'
نظروں سے نظروں کا بندھن' جسم سے جسم جدا'

اپنے گرد اب اپنے آپ میں گھلتی سوچ بھلی،
کس کے دوست اور کیسے دشمن، سب کو دیکھ لیا

راہیں دھڑکیں، شاخیں کڑکیں، اک اک ٹیس اٹل
کتنی تیز چلی ہے اب کے ڈھول بھری دکھنا

دکھڑے کہتے لاکھوں مکھڑے، کس کس کی سنیے
بولی تو اک اک کی ویسی، بانی سب کی جدا

صاحب کا فروٹ فارم

یہ دھوپ، جس کا مہین آنچل،
ہوا سے مس ہے۔۔۔
رتوں کا رس ہے!
تمام چاندی، جو نرم مٹی نے پھوٹتے بور کی چٹکتی چنبیلیوں میں انڈیل دی ہے
تمام سونا، جو پانیوں ٹہنیوں شگوفوں میں بہ کے ان زرد سنگتروں سے ابل پڑا ہے
تمام دھرتی کا دھن، جو بھیدوں کے بھیس میں دور دور تک سر ڈالیوں پر بکھر گیا ہے
رتوں کا رس ہے، رتوں کے رس کو
گداز کر لو،
سبو میں بھر لو،
یہ پتیوں پر جمے ہوئے زرد زرد شعلے، یہ شاخساروں پہ پیلے پیلے پھلوں کے گچھے
جو سبز صبحوں کی سج میں پل کر، کڑی دوپہروں کی لو میں ڈھل کر،
خنک شعاعوں کی اوس پی کر

رتوں کے امرت سے اپنے نازک وجود کے آبگینے بھر کر' حدِ نظر تک'

بساطِ زر پر'

لہک رہے ہیں' شراب ان کی کشید کر لو'

سبو میں بھر لو'

سبو میں بھر لو' یہ مدھ' یہ مدرا' کہ اس کی ہر بوند سال بھر سو صراحیوں

میں دیے جلائے

یہی قرینہ ہے زندگی کا' اسی طرح سے' لہکتے قرنوں کے اس چمن میں' نجانے

کب سے

ہزار ہا تپتے پیلے سورج' لنڈھا رہے ہیں وہ پگھلا تانبا' وہ دھوپ'

جس کا مہین آنچل'

دلوں سے مس ہے' وہ زہر' جس میں دکھوں کا رس ہے'

جو ہو سکے تو اس آگ سے بھر لو من کی چھاگل'

کبھی' کبھی ایک بوند اس کی' کسی نوا میں دیا جلائے'

تو وقت کی پینگ جھول جائے

غزل

میری مانند، خودنگر، تنہا
یہ صراحی میں پھول نرگس کا

اتنی شمعیں تھیں تیری یادوں کی
اپنا سایہ بھی اپنا سایہ نہ تھا

میرے نزدیک تیری دوری تھی
کوئی منزل تھی کوئی عالم تھا

ہائے وہ زندگی فریب آنکھیں
اُس نے کیا سوچا، میں نے کیا سمجھا

صبح کی دھوپ ہے کہ رستوں پر
منجمد بجلیوں کا اک دریا

گھنگھروؤں کی جھنک منک میں بسی
تیری آہٹ۔ میں کس خیال میں تھا

کون یاد آ گیا تھا، یاد نہیں
دل بھی اک ضرب بھول بھول گیا

سارے بندھن کڑے سہی، لیکن
تجھ سے یہ ربط، دھندلا اور گہرا

پھر کہیں دل کے برج پر کوئی عکس
فاصلوں کی فصیل سے ابھرا

پھول مرجھا نہ جائیں بجروں میں
مانجھیو، کوئی گیت ساحل کا

وقت کی سرحدیں سمٹ جاتیں
تیری دوری سے کچھ بعید نہ تھا

عمر جلتی ہے، بخت جلووں کے
زیست مٹتی ہے، بھاگ مٹی کا

رہیں دردوں کی چوکیاں چوکس
پھول لوہے کی باڑ پر بھی کھلا

جو خود ان کے دلوں میں تھا تہِ سنگ
وہ خزانہ کسی کسی کو ملا!

لاکھ قدریں تھیں زندگانی کی
یہ محیط اک عجیب زاویہ تھا

سانس کی رو میں، رونما طوفاں
تیغ کی دھار پر بہے دھارا

ہے جو یہ سر پہ گیان کی گٹھڑی
کھول کر بھی اسے کبھی دیکھا

روز جھکتا ہے کوئے دل کی طرف
کاخِ صد بام کا کوئی زینہ

امجد، ان آنسوؤں کو آگ لگے
کتنا نرم اور گراں ہے یہ دریا

غزل

بڑھی جو حد سے تو سارے طلسم توڑ گئی
وہ خوش دلی، جو دلوں کو دلوں سے جوڑ گئی

ابد کی راہ پہ بے خواب دھڑکنوں کی دھمک
جو سو گئے انھیں بجھتے جگوں میں چھوڑ گئی

یہ زندگی کی لگن ہے کہ رتجگوں کی ترنگ
جو جاگتے تھے انہی کو یہ دھن جھنجھوڑ گئی!

وہ ایک ٹیس جسے تیرا نام یاد رہا
کبھی کبھی تو مرے دل کا ساتھ چھوڑ گئی

رکا رکا ترے لب پر عجب سخن تھا کوئی
تری نگہ بھی جسے ناتمام چھوڑ گئی

فرازِ دل سے اترتی ہوئی ندی، امجدؔ
جہاں جہاں تھا حسیں وادیوں کا موڑ گئی

غزل

جو دل نے کہہ دی ہے، وہ بات ان کہی بھی نہ تھی
یہ موج تو تہِ دریا کبھی رہی بھی نہ تھی
جھکیں جو سوچتی پلکیں تو میری دنیا کو
ڈبو گئی وہ ندی جو ابھی بہی بھی نہ تھی
سنی جو بات کوئی ان سنی تو یاد آیا
وہ دل کہ جس کی کہانی کبھی کہی بھی نہ تھی
نگر نگر وہی آنکھیں، پسِ زماں، پسِ در
مری خطا کی سزا عمر گرہی بھی نہ تھی
کسی کی روح تک اک فاصلہ خیال کا تھا
کبھی کبھی تو یہ دوری رہی سہی بھی نہ تھی
نشے کی رو میں یہ جھلکا ہے کیوں نشے کا شعور
اس آگ میں تو کوئی آب آگہی بھی نہ تھی
غموں کی راکھ سے، امجدؔ وہ غم طلوع ہوئے
جنھیں نصیب اک آہِ سحر گہی بھی نہ تھی

مشاہیر

کیا لوگ تھے، جن کی گردن پر
تلوار چلی۔۔ اک سرد تڑپ
اک خون میں لتھڑی ہوئی کروٹ
اور وقت کے سیمیں دھارے پر
اک سطر لہو کی چھوڑ گئے!

اچھے تھے وہ جن کو سولی کی
رسی سے لٹک کر نیند آئی
اک تیز کھٹک! اک سرد تڑپ
اور وقت کی دکھتی چیخوں میں
اک شبد کی شکتی چھوڑ گئے

مٹی بھی اب ان ساونتوں کی
ان کھوئے ہوئے کھنڈروں میں نہیں
اک سطر لہو کی کانپتی ہے
اک شبد کی شکتی ڈولتی ہے
تاریخ کی گلتی پستک پر!
اک نام کا دھبا باقی ہے
کیا کچھ نہ ملا ان جیالوں کو،
شعلوں پہ قدم رکھنے میں سکوں
جینے کے لیے، مرنے کی لگن!
اے وائے وہ جلتی روحیں جنھیں
ہر درد ملا، منزل نہ ملی!

کل ان کی زرہ پوش آرزوئیں
جس آگ کی رو میں بہتی ہوئی
نیزوں کی انی پر ناچ گئیں
وہ آگ، تمھاری دنیا ہے
وہ آگ تمھارے پاؤں تلے
جتنوں کی لہکتی جنت ہے

اس اگنی سے، اس جیتے جگوں
کی کھلتی ہوئی پھلواڑی سے
دو چار دہکتے پھول چنو!
اتنا ہی سہی، اتنا تو کرو!
تاریخ کی گلتی پستک پر،
اک نام کا دھبا ہو کہ نہ ہو

ہوٹل میں

بادل گرجا۔۔ گرے سنہری پردے دلوں دریچوں پر

بند ہوئے دو گول پپوٹے چونچ میں دب گئی گرم زبان
چھری چلی حلقوم پہ تڑپا تپتے توے پر تڑختا ماس
سج گئے میز پہ مے کے پیالے بٹ گیا طشتوں میں پکوان

چھت پر بارش نیچے اجلے کالر گدلی انتڑیاں
ہنستے مکھ ڈکراتی قدریں بھوکی مایا کے سب مان

باہر۔۔ ٹھنڈی رات کا گہرا کیچڑ۔۔ درد بھرے آدرش
چلو یہاں سے۔۔ ہمیں پکارے ننگی سوچوں کا رتھ بان

ایکٹریس کا کنٹریکٹ

مرا وجود مری زندگی کا بھید ہے، دیکھ
یہ ایک ہونٹ کے شعلے پہ برگِ گل سے خراش
یہ ایک جسم کے کندن میں گدگدی سے گداز
یہ ایک روح، بھنچے بازوؤں میں کھیلتی لہر

ذرا قریب تو آ، دیکھ، تیرے سامنے ہیں
یہ سرخ، رس بھرے، لب، جن کی اک جھلک کیلئے
کبھی قبیلوں کے دل جوشنوں میں دھڑکے تھے!
جو تو کہے تو یہی ہونٹ، سرخ رس بھرے ہونٹ
ترے لہو میں شگوفے کھلا بھی سکتے ہیں!

قریب آ' یہ بدن' میری زندگی کا طلسم'
تری نگاہ کی چنگاریوں کا پیاسا ہے
جو تو کہے تو یہی نرم' لہر یا آنچل'
یہی نقاب' مری چٹکیوں میں اٹکی ہوئی
یہی ادا' مری انگڑائیوں سے مسکی ہوئی
یہ آبشار' ڈھلانوں سے گر بھی سکتی ہے!

بس ایک شرط۔۔۔ یہ گوہر سطور دستاویز
ذرا کوئی یہ وثیقہ رقم کرے تو سہی'
اکائیوں کے ادھر' جتنے دائرے ہوں گے'
ادھر بھی اتنے ہی عکس ان برہنہ شعلوں کے

سانحات

کوئی بھی واقعہ کبھی تنہا نہیں ہوا'۔۔۔
ہر سانحہ اک الجھی ہوئی واردات ہے
آندھی چلے تو گرتی ہوئی پتیوں کیساتھ
لاکھوں صداقتوں کے ہیں ڈانڈے ملے ہوئے
دیکھے کوئی تو دیکھتی آنکھوں کے سامنے
کیا کچھ نہیں کہ دیکھنا جس کا محال ہے
اک جام اٹھا کے میں نے زمیں پر پٹخ دیا'
سوچو' اس ایک لمحے میں کیا کچھ نہیں ہوا
ہر سمت ڈھیر' صد صدفِ سانحات کے
قوسِ کنارِ قلزمِ دوراں پہ لگ گئے
پرکھو' تو رنگ رنگ کی ان سیپیوں پہ ہے
لہروں کے تازیانوں کی تحریر' الگ الگ

چاہو تو واقعات کے ان خرمنوں سے تم
اک ریزہ چن کے فکر کے دریا میں پھینک دو
پانی پہ اک تڑپتی شکن دیکھ کر ہنسو!
چاہو تو واقعات کی ان آندھیوں میں بھی
تم یوں کھڑے رہو کہ تمھیں علم تک نہ ہو
طوفاں میں گھر گئے ہو کہ طوفاں کا جزو ہو

مرے خدا ! مرے دل!

مرے ضمیر کے بھیدوں کو جاننے والے،
تجھے تو اس کی خبر ہے، مرے خدا، مرے دل
کہ میں ان آندھیوں میں عمر بھر، جدھر بھی بہا
کوئی بھی دھن تھی میں اس لہر کی گرفت میں تھا
جو تیری سوچ کی سچائیوں میں کھولتی ہے
ہے جس کی رو میں تری ضو، مرے خدا، مرے دل
کہ اس طلسم زیاں کے کسی جھمیلے میں،
ذرا کبھی جو قدم میرے ڈگمگا بھی گئے،
تو اک خیالِ ابد موج سلسلوں کا خیال
مرے وجود میں چنگاریاں بکھیر گیا،
سنبھل کے دیکھا تو دنیا میں اور کچھ بھی نہ تھا
نہ دکھتی سانس کے ارماں، نہ جیتی مٹی کے بوجھ
نہ کوئی روگ، نہ چنتا، نہ میں، نہ میرے جتن،
جو مجھ میں تھا بھی کوئی گن ترے ہی گیان سے تھا
کچھ اور ڈوب کے گہرائیوں میں جب دیکھا

تو ہر سلگتی ہوئی قدر کے مقدر میں
نہاں تھے تیرے تقاضے مرے خدا مرے دل
ہیں تیری کرنوں میں کڑیاں چمکتے قرنوں کی
تجھے تو اس کی خبر ہے مرے خدا مرے دل
کہ اس کرے پہ ہے جو کچھ بھی اسکے پہلو میں
وہ شعلے جن پہ شکن ہے تری ہی کروٹ کی
ترے ہی دائرے کا جزو ہیں وہ دور کہ جب
چٹانیں پگھلیں ستارے جلے زمانے ڈھلے
وہ گردشیں جنھیں اپنا کے ان گنت سورج
ترے سفر میں بجھے تو انہی اندھیروں سے
دوامِ درد کی اک صبح ابھری پھول کھلے
مہک اٹھی تری دنیا مرے خدا مرے دل
گھلا ہوا مری سانسوں میں ہے سفر تیرا
تجھے تو اس کی خبر ہے مرے خدا مرے دل
کہ گو یہی مرا پیکر ضمیر خاک سے ہے
مگر اسی مرے تپتے بدن کی بھٹی سے
کشید ہوتی ہوئی ایک ایک ساعتِ زیست

وہ گھونٹ زہر کا ہے جو مجھی کو پینا پڑا
یہ زہر کون پیے؟ کون اپنے سینے میں
یہ آگ انڈیل کے ان ساحلوں سے بھید چنے
جہاں پہ بکھرے ہیں صد ہا صداقتوں کے صدف!
یہ زہر کون پیے؟ کون بجھتی آنکھوں سے
غروبِ وقت کی خندق کے پار دیکھ سکے
جہاں ازل کے بیاباں میں عمر پیما ہے
حقیقتوں کا وہ دھارا، کہ جس کی لہروں میں آج
گلوں کا رس بھی ہے فولاد کا پسینہ بھی!
مرا شعور انہی گھاٹیوں میں بھٹکا ہے
قدم قدم پہ مری ٹھوکروں کی زد میں رہیں
کرخت ٹھیکریاں ان کٹھور ماتھوں کی
جو زندگی میں ترے آستاں پہ جھک نہ سکے
قدم قدم پہ سیہ فاصلوں کے سنگم پر
بس اک مجھی کو اس ان مٹ تڑپ سے حصہ ملا
تری جرس کی صدا میں ہیں رت جگے جس کے
یہی تڑپ تری کایا، یہی تڑپ، مرا انت

جو انت بھی ہو، سو ہو، میں تو مٹی مٹی ہوں
دھڑکتی ریت کے بے انت جھکڑوں میں سدا
رواں رہیں، ترے محمل! مرے خدا مرے دل،
تری ہی آگ کی میٹھی سی آنچ میں مرے دکھ
یہ راز تو ہی بتا اب، مرے خدا، مرے دل
یہ بات کیا کہ ترے بے خزاں خزانوں سے
جو کچھ ملا بھی ہے مجھ کو تو اک یہ ریزۂ درد،
ہیں جسکی جھولی میں کھلیان تیرے شعلوں کے
اور اب کہ سامنے، جلتی حدوں کی سرحد ہے
ہر ایک سمت مری گھات میں ہیں وہ روحیں
جو اپنے آپ میں اک راکھ کا سمندر ہیں
یہ روحیں، بس بھرے ذی جسم، آہنیں سائے
انہی کے گھیرے میں ہیں اب یہ بستیاں یہ دیار
کہیں یہ سائے، جو پتھرائی آرزوؤں کو،
سراب زر کی کشش بن کے گدگداتے ہیں
مری لگن کو نہ ڈسنے لگیں، میں ڈرتا ہوں
کہیں یہ سائے، یہ کیچڑ کی مورتیں، جن کے

بدن کے دھبوں پہ رختِ حریر کی ہے پھبن'
مری کرن کی نہ چھب نوچ لیں' میں ڈرتا ہوں
کہیں یہ آگ نہ بجھ جائے جسکے انگ میں ہیں
ترے دوام کی انگڑائیاں' میں سوچتا ہوں'
نہیں' یہ ہو نہ سکے گا! جو یوں ہوا بھی تو پھر؟
نہیں! ابھی تو یہ اک سانس! ابھی تو ہے کیا کچھ
ابھی تو جلتی حدوں کی حدیں ہیں لامحدود'
ابھی تو اس مرے سینے کے ایک گوشے میں
کہیں' لہو کے تریڑوں میں' برگِ مرگ پہ اک
کوئی لرزتا جزیرہ سا تیرتا ہے جہاں
ہر اک طلب تری دھڑکن میں ڈوب جاتی ہے
ہر اک صدا ہے کوئی دور کی صدا' مرے دل
مرے خدا' مرے دل

جلوسِ جہاں

میں پیدل تھا' میرے قریب آ کے اس نے' بہ پاسِ ادب' اپنے تانگے کو روکا'
اچانک جو بجریلی پٹڑی پہ سم کھڑکھڑائے' سڑک پر سے پہیوں کی آہٹ
پھسل کر جو ٹھہری'
تو میں نے سنا' ایک خاکستری نرم لہجے میں' مجھ سے کوئی کہہ رہا تھا'
''چلیں گے کہیں آپ؟ بازار' منڈی' سٹیشن' کچہری!
پلٹ کر جو دیکھا' تو تانگے میں کوئی سواری نہیں تھی' فقط اک فرشتہ' پھٹے
کپڑے پہنے' عنانِ دو عالم کو تھامے ہوئے تھے

میں پیدل تھا' اتنے میں کڑکا کوئی تازیانہ' بہا فرشِ آہن پہ ٹاپوں کا
سرپٹ تریڑا'
کوئی تند لہجے میں گرجا' ''ہٹو سامنے سے ہٹو'' اور پُرشور پہیے گھنا گھن مری
سمت جھپٹے'
بہ مشکل سنبھل کر جو دیکھا' کھچا کھچ بھرے تیز تانگے کی مسند پہ' اک
صورتِ سگ لجام فرس پر جھکی تھی!

یہ لطف کریمانہ خوشدلاں بھی‘ یہ پرغیظ خوئے سگاں بھی‘
مرے ساتھ رو میں ہیں لوگوں کے جتنے رویے‘ یہ سب کچھ یہ سارے
قضیے‘
غرض مندیاں ہی غرض مندیاں ہیں‘ یہی کچھ ہے اس رہگزر پر متاعِ
سواراں‘
میں پیدل ہوں‘ مجھ کو جلوسِ جہاں سے انہی ٹھوکروں کی روایت ملی ہے‘

ایک فلم دیکھ کر!

دھیرے دھیرے ساز بجے'
اس کے انگ انگ نے اک انگڑائی لی'
ابھری رقص کی لے'
لچکی اس کے بدن کی ڈھال
اک اک تیز نرت کے ساتھ
ناچتے جسم سے اک اک بندھن اترا'
اک اک تکمہ ٹوٹا' پلو ڈھلک ڈھلک کر' رکے' گرے'
اور پھر'۔۔۔سامنے' اک
جگ مگ جسم
گرتی مڑتی' ٹوٹ ٹوٹ کے جڑتی۔۔۔مرمر کی ڈھلوان'
قاشیں' رگیں' خلیے' ماس' مسام
سب کچھ' ایک تھرکتے بہتے عکس کا جزو'
سب کچھ' جسم کی باغی سلطنتوں کی ایک عجب دنیا
گول سڈول کرے انمول زمینیں' ساحل' جھرنے' دھوپ'

چاندنی، مخمل، پھول،
سب کچھ، رقص کے روپ میں ڈھلتا، ٹک ٹک چلتا، اک متحرک عکس،
سب کچھ، پاس بلاتے، پیاس بڑھاتے، ارمانوں کے سراب!

آج اک دوست نے پاس بلا کر چائے پلا کر مجھ سے مری اک بوسیدہ سی نظم سنی،
اور پھر اس کے بعد یہ فلم!
باہر نکلا تو سنسان سڑک تھی، شبِ خزاں تھی، ٹھنڈی تیز ہوا میں ننگی شاخیں ناچ رہی تھیں،
میں بھی، میری نظم بھی، دونوں تھر تھر کانپ رہے تھے، اتنے لبادوں میں،

خطۂ پاک

خطۂ پاک، ترے نام دل آرا کی قسم،
کتنے سچے ہیں، سجیلے ہیں، جیالے ہیں، وہ دل،
جاگتی، جیتی، زرہ پوش، چٹانوں کے وہ دل،
جن کے مواج لہو کا سیلاب،
تیری سرحد کی طرف بڑھتی ہوئی آگ سے ٹکرایا ہے،

دیکھتے دیکھتے بارود کی دیوار گری،
ہٹ گئے دشمن کے قدم،
خندقیں اٹ گئیں شعلوں سے۔۔۔مگر ہائے وہ دل،
زندہ۔۔نا قابلِ تسخیر۔۔عظیم!

ہائے دلوں کی وہ فصیل،
جاوداں اور جلیل،
جس کے زینوں پہ ظفرمند ارادوں کی سپاہ،
جس کے برجوں میں ملائک کے جیوش،
جس کا پیکر ہے کہ اک سطرِ جلی،
لوحِ ابد پر تاباں
آیۂ عمرِ شہیداں کی طرح!

جہاں نورد

سفر کی موج میں تھے، وقت کے غبار میں تھے
وہ لوگ، جو ابھی اس قریۂ بہار میں تھے

وہ ایک چہرے پہ بکھرے عجب عجب سے خیال
میں سوچتا تو وہ غم میرے اختیار میں تھے

وہ ہونٹ، جن میں تھا میٹھی سی ایک پیاس کا رس
میں جانتا تو وہ دریا مرے کنار میں تھے

مجھے خبر بھی نہ تھی اور اتفاق سے کل
میں اس طرف سے جو گزرا، وہ انتظار میں تھے

میں کچھ سمجھ نہ سکا، میری زندگی کے وہ خواب
ان انکھڑیوں میں جو تیَرے تھے کس شمار میں تھے

میں دیکھتا تھا۔۔۔ وہ آئے بھی اور چلے بھی گئے
ابھی یہیں تھے۔۔۔ ابھی گردِ روزگار میں تھے

میں دیکھتا تھا۔۔۔ اچانک' یہ آسماں' یہ کرے
بس ایک پل کو رکے اور پھر مدار میں تھے

ہزار بھیس میں' سیار موسموں کے سفیر'
تمام عمر مری روح کے دیار میں تھے

کون دیکھے گا۔۔۔

جو دن کبھی نہیں بیتا' ۔۔۔ وہ دن کب آئے گا
انہی دنوں میں اس اک دن کو کون دیکھے گا!

اس ایک دن کو۔۔۔ جو سورج کی راکھ میں غلطاں
انہی دنوں کی تہوں میں ہے۔۔۔ کون دیکھے گا

اس ایک دن کو۔۔۔ جو ہے عمر کے زوال کا دن
انہی دنوں میں نمو یاب کون دیکھے گا

یہ ایک سانس۔۔ جھمیلوں بھری جگوں میں رچی
اس اپنی سانس میں کون اپنا انت دیکھے گا

اس اپنی مٹی میں' جو کچھ امٹ ہے' مٹی ہے
جو دن' ان آنکھوں نے دیکھا ہے' کون دیکھے گا

میں روز ادھر سے گزرتا ہوں، کون دیکھتا ہے
میں جب ادھر سے نہ گزروں گا، کون دیکھے گا

دو رویہ۔۔ ساحلِ دیوار، اور۔۔ پسِ دیوار
اک آئینوں کا سمندر ہے، کون دیکھے گا

ہزار چہرے خود آرا ہیں، کون جھانکے گا
مرے نہ ہونے کی ہونی کو کون دیکھے گا

تڑخ کے گرد کی تہ سے اگر کہیں کچھ پھول
کھلے بھی، کوئی تو دیکھے گا۔۔۔ کون دیکھے گا

اس دن اس بریلی تیز ہوا۔۔۔

اس دن اس بریلی تیز ہوا کے سامنے میں کچھ پہلے سے بھی زیادہ بوڑھا
بوڑھا سا لگتا تھا
شاید واقعی اتنے ترس کے قابل ہی تھا
اس دن تم نے مجھ سے کہا تھا'
اک دن میرے لیے تم اس دنیا کو بدل دو گی' یہ تم نے کہا تھا'

اس دن بھری سڑک پر تم نے پیڈل روک کے۔۔۔
اپنے بائیسکل کو میرے بائیسکل کے' ساتھ ساتھ چلا کر' مجھ سے کہا تھا:
''آپ ایسے لوگوں کو بھی روز یہاں پتھر ڈھونے پڑتے ہیں' روٹی کے
ٹکڑے کی خاطر''
تھوڑی دور تک بھری سڑک پر' دو پہیوں کے ساتھ وہ پہیے ڈولے تھے'
دندانوں میں ٹک ٹک کتے بولے تھے' سب دنیا نے دیکھا تھا'

اور اس دن میں نے اپنے دل میں سوچا تھا'
''کیسا شہر ہے یہ بھی' ایسی ایسی باغی روحیں بھی اس میں بستی ہیں۔۔۔''

میں تو اسی تمھارے شہر میں اب بھی روز اک میز پہ پتھر ڈھونے جاتا ہوں' کاغذ کے پتھر'
لیکن جانے تم اب کہاں ہو' اے ری گول مٹول' سیانی گڑیا'

بیٹی! شاید تم تو کہیں کسی دہلیز پہ دو منقوط گلابی گال آنکھوں سے لگا کر نئی سفید جرابوں والے کسی کے ننھے سے پیروں میں گرگابی کے تسمے کسنے بیٹھ گئیں۔۔۔ اور یہاں' ادھر اب' ساتھ ساتھ جڑے ہوئے میزوں کی ایک لمبی پٹڑی بچھ بھی چکی ہے' حد زمیں تک' ظلم کے ٹھیلے روز اس پٹڑی پر' بے بس زندگیوں کو دور افق کے گڑھے میں ڈھونے آتے ہیں!

اور میں' اب بھی تمھارے کہے پر' اس پٹڑی کے اک تختے پر'
عمروں کی گنتی کے چھٹے دہے پر
اس دنیا کا رستہ دیکھ رہا ہوں' جس میں تمھارے نازک دل کی مقدس سچائی کا حوالہ بھی تھا'
جانے پھر تم کب گزرو گی ادھر سے۔۔۔ اس دنیا کو ساتھ لیے۔۔۔

ایکسیڈنٹ

مجھ سے روز یہی کہتا ہے' پکی سڑک پر وہ کالا سا داغ' جو کچھ دن پہلے'
سرخ لہو کا تھا اک چھینٹا' چکنا' گیلا' چمکیلا چمکیلا'
مٹی اس پہ گری اور میلی سی اک پپڑی اس پر سے اتری' اور پھر سیندھوری
سا اک خاکہ ابھرا'
جواب پکی سڑک پر کالا سا دھبہ ہے' بسی ہوئی بجری میں جذب اور
جامد۔۔ اَن مٹ!
مجھ سے روز یہی کہتا ہے' پکی سڑک پر مسلا ہوا وہ داغ لہو کا:

''میں نے تو پہلی بار اس دن
اپنی رنگ برنگی قاشوں والی گیند کے پیچھے
یونہی ذرا اک جست بھری تھی
ابھی تو میرا روغن بھی کچا تھا
اس مٹی پر مجھ کو انڈیل دیا یوں کس نے

اوں اوں ۔۔ میں نہیں مٹتا' میں تو ہوں' اب بھی ہوں

میں یہ سن کر ڈر جاتا ہوں:
کالی بجری کے روغن میں جینے والے اس معصوم لہو کی کون سنے گا؟
ممتا بک بھی چکی ہے چند ٹکوں میں
قانون آنکھیں میچے ہوئے ہے'
قاتل پہیے بے پہرا ہیں'

ڈر کا ہے کا

ڈر کاہے کا'
جتنا زور تمھارے خیال کی رو سے تمھارے بدن میں ہے وہ سارا زور لگا کر
(اور تمھاری صحت بھی تو خیر سے اتڈی پڑتی ہے نا)
اپنے سارے بدن کا زور لگا کر
چھینو۔۔۔اس سے' حصہ اس کے روز ینے کا'
اس سے' ہر عکس اس کے آئینے کا'
سب سے' حق جینے کا'
ڈر کاہے کا'
گرجو' اور کالے رسوں کی گرہیں کھل جائیں گی
بھپرو' اور جابر ہاتھوں کی ریکھائیں گھل گھل جائیں گی
جھپٹو' اور سب قدریں اک میزان میں تل جائیں گی'

یوں بھی نہ مقصد حاصل ہو تو پھر کیا'
دیکھو، تمھارے گٹھیلے جثّے میں ہے ذہن کی جتنی طاقت' اس کو کام میں لاؤ'
اس اک حرف کو دیکھو' شکل ہے جس کی اک زنجیر کی صورت
بھرے کٹہرے میں تم میز پہ مکہ مار کے کہہ دو
''یہ اک حرف تو اس پستک میں نہیں کہیں بھی۔''
پستک جس کے سب حرف اور سب سطریں سیدھی ہیں''
تم دیکھو گے' ترازو کا وہ پلڑا جس میں تم ہو تمھاری جانب جھک جائے گا'

رہ گئی اک یہ مقدس مٹی۔۔۔ ہمیں تو ہیں اس کے ریزہ چیں'
ہم اس کی خاطر جی لیں گے' ہم اس کی خاطر مر لیں گے

نیلے تالاب

سب اس گھاٹ پہ اک جیسے ہیں
جب سے نیل گگن کی ٹینکی سے پانی برسا ہے'
جب سے سات سمندر' سات بھرے ہوئے ٹب' پانی کے'
اس آنگن میں رکھے ہیں'
پہلے بھی سب لوگ اس گھاٹ پہ اک جیسے تھے'
اور'۔اب بھی' اس کالے نل میں' جب سے
کھٹ سے' کھچ کر آنے والا پانی
چھک سے گرنے لگا ہے
چکنی اینٹوں والے گھاٹ پہ' سارے خدا اور سارے فرشتے اور سب
روحیں اپنے غرور کی اس پھسلن میں اک جیسی ہیں'
اے رے شہر ابد کے واٹر ورکس کے رکھیا'
دلوں کی صدرخ نلکی میں اپنی سطحیں ہموار نہ رکھ سکنے والے سب پانی'
سارے مقدس پانی
کس طرح تیرے نیلے تالابوں میں آ کر یک سو ہو جاتے ہیں'

آواز کا امرت

اک اک روح کے آگے اک دیوار ہے اونچی گلے تک
اک دیوار ہے رمزِ دروں کی
اس دیوار کے اندر کی جانب جتنا کچھ بھی ہوتا ہے جس کے پاس خزانہ
اک دردانہ یا اک تال مکھانہ
نقدِ باطن یا کم از کم۔۔۔ آب ودانہ
جتنا کچھ بھی پاس ہو اتنی ہی دیوار یہ موٹی ہوتی ہے اور اس دوری کے باعث
اتنی ہی اس روح کی بات ذرا گھمبیر اور گہری ہو جاتی ہے
اپنے بوجھ سے بوجھل ہو جاتی ہے
دیر سے سننے میں آتی ہے
اپنے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے روح نہ اس کا کوئی دھندا
اپنے پاس تو صرف اک یہ آواز ہے جس کے آگے کوئی بھی دیوار نہیں
ہے

سن سے تمھارے پاس پہنچ جاتی ہے

اس آواز میں رمز دروں کے سارے غیر مقطر زہر ہیں' اس کا برا نہ مانو'

کبھی کبھی جی میں آئے تو' سن لو

چن لو

رکھ لو

چکھ لو

"تینوں رب دیاں رکھاں"

تاروں بھرے دریاؤں جیسی۔۔۔لمبی تانوں والا یہ نغمہ۔۔۔

دور، پہاڑوں میں چکراتی ہواؤں جیسی۔۔۔پیچاں سی یہ لَے۔۔۔

اب بھی جس کی گونج میں ایک مقدس دکھ کا بلاوا ہے۔۔۔

میں جب بھی یہ گانا سنتا ہوں

مجھ کو یاد آ جاتے ہیں وہ لوگ

جن کے لیے اس دن، اس آگ کی آندھی میں، یہ بول ہماری یادیں لے

کر آئے تھے

مجھ کو یاد آ جاتے ہیں وہ لوگ، جنھوں نے اس دن، اتنے دھماکوں میں

ان شبدوں کو سنا

اور ہمارے بارے میں سوچا،

جو کچھ سوچا۔۔۔کر گزرے،

ان کی انہی سوچوں کی دین ہیں یہ سب دن، ہم جن میں جیتے ہیں

جن میں جئیں گے آنے والے جینے والے بھی،

انہی دنوں کا سرگم میرے دل کی سپتک پر چھڑ جاتا ہے،

جب بھی میں گانا سنتا ہوں۔۔۔

فرد

اتنے بڑے نظام میں صرف اک میری ہی نیکی سے کیا ہوتا ہے
میں تو اس سے زیادہ کر ہی کیا سکتا ہوں
میز پر اپنی ساری دنیا
کاغذ اور قلم اور ٹوٹی پھوٹی نظمیں،
ساری چیزیں بڑے قرینے سے رکھ دی ہیں
دل میں بھری ہوئی ہیں اتنی اچھی اچھی باتیں
ان باتوں کا دھیان آتا ہے تو یہ سانس بڑی ہی بیش بہا لگتی ہے
مجھ کو بھی تو کیسی کیسی باتوں سے راحت ملتی ہے
مجھ کو اس راحت میں صادق پا کر
سارے جھوٹ مری تصدیق کو آ جاتے ہیں
ایک اگر میں سچا ہوتا
میری اس دنیا میں جتنے قرینے سجے ہوئے ہیں
ان کی جگہ بے ترتیبی سے پڑے ہوئے کچھ' ٹکڑے ہوتے
میرے جسم کے ٹکڑے'۔ کالے جھوٹ کے اس چلتے آرے کے نیچے!
اتنے بڑے نظام سے میری اک نیکی ٹکرا سکتی تھی
اگر اک میں ہی سچا ہوتا

کبھی کبھی وہ لوگ۔۔۔

کبھی کبھی وہ لوگ بھی جن کا ناؤں لکھا ہے
کتنے موضعوں کے پٹواریوں کی کھیوٹ میں
میرے دل کے اندر بیٹھ کے میری باتوں کو سنتے ہیں
پیارے مجھ کو دیکھتے ہیں یوں جیسے اس گودام میں کاغذ چاٹنے والا اک
کیڑا ہوں'
مجھے خبر ہے' دشمن اکثر غرانے سے پہلے ممیاتا ہے
لیکن میرا جی نہیں ڈرتا'
مجھ پہ جھپٹ کے مجھ سے آخر وہ چھینیں گے بھی کیا'
اپنے پاس کوئی رجواڑا لالچ کا نہیں ہے
اک دو حرف ہیں جن کی گرمی میرے لہو میں لہراتی ہے
ان لوگوں کی ریڑھ کی نلکی میں ہے گودا بھی سونے کا
کوئی کیسا ریلا آئے

انکا پشتیبان وہ پشتہ بہ نہیں سکتا، جسکے ذرے آبِ زر سے جڑے ہیں

اے وہ، اپنے دوام کو جس نے، حرف کے پیرائے میں دیکھا

تیرے سپرد ہیں میرے ٹوٹے پھوٹے، مٹی کے، یہ شبد کہ جن میں

میری مٹی کی روزی ہے

دن تو جیسے بھی ہوں۔۔۔

دن تو جیسے بھی ہوں۔۔۔آخر اک دن'
دنوں کی اک اک سچائی کو جھوٹ کے تیشے مقرض کر دیتے ہیں
دیکھو۔۔۔سوچو۔۔۔
دل کی اس پیچاک میں ہیں جو شکنجے' وہ تو ویسے ہی تھے'
اس پیچاک سے نچڑا ہوا وہ گیہوں' جو' زیتون کا رس تو ویسا ہی تھا'
جسموں کی سب کارگہیں تو ویسی ہی تھیں'
جب اک گورا پلٹن اس سنگھاسن پر پہرا دیتی تھی' تب بھی
اور اب بھی جب ہم نے مستقبل کا سارا بوجھا اپنے شانوں پر بانٹ لیا ہے
گورا پلٹن کی سنگینوں کے سائے میں بھی بھوجن ملتا تھا
فرعونوں کی خدائی میں بھی بندے پتل بھات سے بھر لیتے تھے
اور اب اپنے گھروں میں ہم ہر اک مُنہج آسائش رکھتے ہیں
تو کیا صرف ہمیں سچے ہیں؟
کیا وہ سب جھوٹے تھے؟

یوں تو آج ہم ان پہ ترس کھاتے ہیں

جن کی پتھر ڈھوتی عاجزیاں فرعونوں کے چابک کھاتی تھیں'
لیکن کیا اس بات کی ان کو خبر تھی۔۔۔
کیا اس بات کی ہم کو خبر ہے۔۔۔
اس دنیا میں جو کچھ بھی ہے' اس کا حاصل تو وہ سچائی ہے' جس کو
آخر جھوٹ کے تیشے مقرض کر دیتے ہیں'

پھر کیوں یہ سب دریا' چہروں کھوپڑیوں کے دریا' ان گلیوں میں بہتے ہیں
شہرِ ازل کے اونچے پل کی کھڑی ڈھلان سے لے کر'
ان گلیوں' ان دہلیزوں تک بہتے' آتے' دریا'
دریا' جن پہ شکن ہے۔۔۔ چھاپ لہو کی'
آخر اس ریلے میں کون اچھا تھا۔۔۔
آخر سچ کے تٹ پر کون اترا ہے۔۔۔؟

اپنی آنکھوں میں یوں کانٹے بھر کر میری جانب مت دیکھو۔۔۔ میں سچ
کہتا ہوں' سوچو
آخر سچ کے تٹ پر کون اترا ہے۔۔۔!

پھولوں کی پلٹن

آج تم ان گلیوں کے اکھڑے اکھڑے فرشوں پر چلتے ہو'
بچو' آؤ تمھیں سنائیں گزرے ہوئے برسوں کی سہانی جنوریوں کی کہانی'
تب یہ فرش نئے تھے۔۔۔
صبح کو لمبے لمبے اوورکوٹ پہن کر لوگ گلی میں ٹہلنے آتے'
ان کے پراٹھوں جیسے چہرے ہماری جانب جھکتے رہتے'
پھر وہ ٹہلتے ٹہلتے ہمارے پاس آجاتے'
بڑے تصنع سے ہنستے اور کہتے'
''ننھو' سردی تمھیں نہیں لگتی کیا؟''

ہم سب بھرے بھرے جزدان سنبھالے'
لوچیں ہاتھوں میں لٹکائے'
بنا بٹن کے گریبانوں کے پلو ادھڑے کاجوں میں اٹکائے
تیز ہواؤں کی ٹھنڈک اپنی آنکھوں میں بھر کر
چلتے چلتے' تن کے کہتے: ''نہیں تو' کیسی سردی۔ ہم کو تو نہیں لگتی۔۔۔!''

بچو! ہم ان اینٹوں کے ہم عمر ہیں، جن پر تم چلتے ہو،
صبح کی ٹھنڈی دھوپ میں بہتی، آج تمھاری اک اک صف کی وردی،
ایک نئی تقدیر کا پہناوا ہے
اجلے اجلے پھولوں کی پلٹن میں چلنے والو
تمھیں خبر ہے، اس فٹ پاتھ سے تم کو دیکھنے والے اب وہ لوگ ہیں
جن کا بچپن ان خوابوں میں گزرا تھا جو آج تمھاری زندگیاں ہیں

یہ بھی کوئی بات ہے۔۔۔

یہ بھی کوئی بات ہے کہنے کی
لیکن لو ہم کہے ہی دیتے ہیں

دوہا' بول' کبت' کیا رکھا ہے ان میں۔۔۔
زخم بھلا کب سلے ہیں شبدوں سے۔۔۔

جلتی سطروں سے کب ڈھلی ہیں تقدیریں
بس' یہی' لے دے کے' کچھ عرصے کو'
دھیمی دھیمی سی وہ جلن دب جاتی ہے
جو اس وقت ابھرتی ہے'
جب دل میں گھن لگتا ہے'

آخر ذرا سی اس تسکین کی خاطر' کون
سارے جگ کا بیر سہے

کون کہے؟ کیا حاصل ہے اس بات کے کہنے سے؟
بات بھی یہ کہ زمانے میں:
زینہ بہ زینہ بندے پر بندے کی تلوار معلق ہے'

چھوڑیں بھی اس بات کو۔۔۔ چلو یہی سوچیں'
شاید اک دن کوئی سچ اس سچ کو جھٹلا دے'
(اپنا دل تو اگرچہ مشکل سے یہ مانے گا۔۔۔!)

ایک صبح ۔۔۔ سٹیڈیم ہوٹل میں

یوں تو اس چوکور تپائی کی اس سادہ سی بیٹھک میں کیا رکھا ہے'
لکڑی کی اک عام سی شے ہے' پڑی ہے'
یوں تو اس پر رکھے ہوئے گل دان میں کیا رکھا ہے'
پیلے پیلے سے کچھ تازہ پھول ضرور ہیں اس میں
پھول تو گلدانوں میں ہوتے ہی ہیں
اور پھر اس چوکور تپائی پہ گرنے والا' ہوا کا ترچھا جھرنا
جس میں دھوپ کی نازک سی جھلکی سونے کا رنگ بکھیر گئی ہے
خیر' یہ دھوپ کی رنگت بھی تو جگہ جگہ ہے

لیکن یہ سب چیزیں' اور یہ چاروں خالی کرسیاں' اور یہ سب کچھ' مل کر
ایک عجب آسودہ سی ترتیب ہے' ساکت ساکت'
میرا ذہن کچھ اتنا الجھا ہوا ہے' مجھ کو چیزوں کی ترتیب اچھی لگتی ہے
جانے کون یہاں آ کر بیٹھے گا ۔۔۔'
سب کچھ اک آنے والے اچھے سمے کا ان ہونا پن ہے!

ان لوگوں کے اندر۔۔۔

ان لوگوں کے اندر، جن کے اندر میں بھی ہوں،
میرے برعکس، ایسے بھی
ہیں کچھ لوگ،
جن کی باتوں کے کچھ سچے روپ،
ان کے حربے ہیں،
لیکن یہ سچ ان کا نہیں ہوتا،
یہ سچ اوروں سے چھینا ہوا ہوتا ہے
اپنے جھوٹ اور اپنی بدی کو چھپانے کی خاطر
وہ اوروں کی اک اک اچھائی کو ہتھیا لیتے ہیں
اور پھر اس ہتھیار کو لے کر جب وہ چلتے ہیں
ساری دنیا ان سے ڈرتی ہے،

یہ بھی کیسا زمانہ ہے
جب اچھوں کی سب اچھائیاں، بروں کے ہاتھوں میں
حربے ہیں،
سچے لوگ اگر جیوٹ ہوں
کون ان کے منہ آئے گا
جھوٹ کے اس تالاب کے سب کچھوے
اپنے اپنے خول میں، اپنے اپنے کالے ضمیروں میں،
چھپ جائیں گے

میٹنگ

ان کے جسموں کے پیچاک تو دیکھو'
ان کے جسموں پر یہ زرہیں بھی تو دیکھو'
سمٹے سمٹے لپیٹوں والی زرہیں
جن سے اپنے گمان میں وہ اپنی روحوں کی رکھوالی کرتے ہیں
سمٹے سمٹے لپیٹوں والی زرہیں
ان کی زرہیں' تو ان کی سوچوں کے سمتاوے ہیں
جن کے ذریعے۔۔۔
ہم پہ جھپٹنے سے پہلے' وہ
اپنے آپ کو' اپنی روح کے اک کونے میں سمیٹ لیا کرتے ہیں
اور پھر ان کے سب اعضا' سب عضلے' کسے کسے سے نظر آتے ہیں
جیسے رسّے،
جیسے ابھی ابھی جب بٹے بٹے سے رسوں کے یہ مٹھے'
کھل کر بکھریں گے تو اژدر بن جائیں گے
اس دن میں نے دیکھا' جیسے
اک اک کرسی پر اک رسوں کا مٹھا بیٹھا ہو'

اپنے یہ ارمان۔۔۔

اپنے یہ ارمان تو سب غرضیں ہیں' کھری بھی اور کھوٹی بھی
ان سب غرضوں کی دھن اس کی دھن ہے
اور ہمارے خیالوں کے اندر تو بھونروں کی روحوں کے بھنور ہیں
اڈ اڈ کر اپنی غرض کی سیدھ میں ہم آتے ہیں
جو بھی رستہ کاٹے اس کو ہم ڈستے ہیں
پھر جب من کی باتیں پوری ہوتی نظر نہیں آتیں
ذہن ہمارا دنیا والوں کے بھیدوں کو پرکھنے لگ جاتا ہے
اک یہ پرکھ ہی تو ہے جو یوں نفرت سکھلاتی ہے
اپنی محرومی لاکھوں شاخوں والی اک قدر ہے جس کی
سب سے مقدس ٹہنی پر نفرت کا پھل لگتا ہے
میرا جی تو بھر بھی چکا اس پھل سے
کب تک دیکھوں میں ٹیڑھی پلکوں سے' ان لوگوں کو'
میری دید سے جو غافل ہیں
کیوں نہ بہا دوں' اک تنکے کی طرح' اس دنیا کو' اس ندی میں' جو
تیری روح کے باغوں میں بہتی ہے
منوا' آج تو تو نے یہ کیا سوچا'
سدا اچھلیں یہ تیری میٹھی سوچیں' مورکھ منوا!

وہ تلوار ابھی۔۔۔

وہ تلوار ابھی تو ایک فولادی خواب ہے تیرے ذہن کی اُن تھک کارگہوں میں

اک دن جب یہ اصیل اور جوہر دار عمل پارے آپس میں جڑ کر،
تیرے دل کی نیام میں ڈھل جائیں گے،
پھر جب اک دن یہ تلوار چلے گی۔۔۔،

لیکن اس دن کے آنے تک۔۔۔ ابھی تو کچھ دن۔۔۔
لاکھوں روگوں والی نگری میں، مٹی کی اس پٹڑی پر،
اپنے دامن میں کیچڑ کے ان پھولوں کو لے کر چلنا ہوگا،
ابھی تو اور بہت کچھ ہوگا،
نیلی، ٹین کی یہ چھت کڑکے گی اور سہما سہما وجود پچک جائے گا،
باہر جانے کتنی آنکھیں ہنسیں گی اور جبڑے کھنکیں گے،

ایسے میں تو گہری بنیادوں والے اک سانس کے بل پر ہی، تو
ان سب کالی دنیاؤں کے بوجھ کو اپنے سر سے جھٹک سکے گا۔۔۔

لیکن ابھی تو سب کچھ اک فولادی خواب ہے تیرے ذہن کی ان تھک
کارگہوں میں،
ابھی تو ہر ہونی ان ہونی نظر آتی ہے،
ابھی تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔۔۔
شاید تو تھک بھی جائے،
شاید اپنے جی کے اسی جیالے پن میں تو جی بھی لے،

ورنہ تیرا وجود۔۔۔

ورنہ تیرا وجود تو سچ کے سمندر میں ہے' مٹی کا وہ پشتہ
جس کے باطن کی جھوٹی خود بستگیاں ہی اس کو سنبھالے ہوئے ہیں
پھر وہ کون ہے' جو خود اپنے فوق سے تجھ کو یہ توفیق عطا کرتا ہے
تیرا ہونا ڈوبنے والوں کی آنکھوں میں ڈھارس بھر دیتا ہے
ورنہ تو تو خود اس ریلے میں ہے اک پشتہ' بہ جانے والا'
پھر وہ کون ہے' جو یوں تیری سمت اشارا کر کے
طوفانوں میں گھری ہوئی روحوں کی بے پتوار نگاہوں سے کہتا ہے:
'اس تنکے کے بازو تھام لو' شاید تم بچ جاؤ' ڈوبنے سے بچ جاؤ'
بندے' جانے کتنے لوگ ہیں جن کو تیری آس پہ جینا آساں ہے'
اور تو خود وہ پشتہ' جس کی جڑوں کو بھنور کی درانتی پیہم کاٹ رہی ہے

تو کیا کر سکتا ہے، بندے

تو خود اپنے باطن کی جھوٹی خود بستگیوں کے سہارے پر باقی ہے

باقی تو ہے اک یہ سچ کا سمندر، جس کی لہریں ہیں تقدیریں

اور ان تقدیروں کے اچھے اچھے دکھاوے

جانے کتنی آنکھوں میں بس جاتے ہیں، تیری نسبت سے!

کتنی آنکھوں میں ہے اک یہ اداس توقع،

کتنی آنکھوں میں ہے اک یہ اداس توقع،

کتنی آنکھیں جن میں ایک ہی دیکھنے والا تیری جانب دیکھ رہا ہے کب تو

اس کی جانب دیکھے

گھور گھٹاؤں۔۔۔

گھور گھٹاؤں کے نیچے۔۔۔
پیڑوں کی لچکیلی باہیں۔۔۔
کونپلوں کے کنگن پہنے۔۔۔
جھک جھک کر۔۔۔
جھیل کے پانی پر سے چننے آئی ہیں۔۔۔
پیلے پیلے پتے اور بھورے بھورے بادل، ۔۔۔

جھیل کی جانب جھکی جھکی۔۔۔
رستے ہی میں جم گئیں شاخوں کی باہیں۔۔۔
جھیل سے کون اٹھا کر دے ان کو۔۔۔
پیلے پیلے پتے اور بھورے بھورے بادل،

چاروں اور سے اُمڈی اُمڈی گہری چھاؤں سہانی ہریاول،
تھم گئی آ کر زنگ آلود سلاخوں والی اس کھڑکی کے پاس
جس نے جھریوں والا کالا چہرا میرے دل کا کب اس ٹھنڈک کو محسوس کرے

اپنی خوب سی اک خوبی۔۔۔

اپنی خوب سی اک خوبی میں اس کے لیے اک مستی تھی،
اور اپنی اس خوبی کے لچھن دیکھے اس نے، سب دنیا سے چھپ کر،

اب وہ خوبی بھولا ہوا اک خوابِ خوباں ہے
لوگوں کے ذہنوں میں، اس خوبی کی بابت، اب اک میٹھی میٹھی نفرت ہے
پھر بھی کون اب ایسی باتوں کے بارے میں بات کرے
سب کی زبانیں چپ ہیں، سب کے دل اس علم پہ نادم ہیں
ساری معرفتیں اب بے بس ہیں

وہ مچھلی بس اک بار اس گندے پانی میں نہائی تھی
اور اب زریں طاق پہ اک شیشے کی صراحی میں لہراتی ہے

اب رنگیں صدفوں میں دھنسی ہوئی وہ سرخ مساموں والے گوشت کی گٹھلی
بڑے بڑے لوگوں کی باتوں کے مفہوموں میں
تقدیروں کی کھسر پھسر سے بھرے ڈرائنگ روموں میں
تیرتی ہے اتراتی ہے
مرغولوں کی باچھوں میں مسکاتی ہے
کیسی خوب سی وہ خوبی اس کو راس آئی ہے

تو کس دنیا سے ٹکرانے آیا ہے
تو کس جگ کی کایا بدلنے آیا ہے
کوڑھی اوگن ہار دلا!

غزل

اک اچھائی میں سب کایا دنیا کی
اس برتاؤ میں ہے سب برتا دنیا کی

پھول تو سب اک جیسے ہیں سب مٹی کے
رت کوئی بھی ہو دل کی یا دنیا کی

اس اک باڑ کے اندر سب کچھ اپنا ہے
باہر۔۔۔ دنیا؟ کس کو پروا دنیا کی!

ان چمکیلے زینوں میں یہ خوش خوش لوگ
چہروں پر تسکینیں دنیا دنیا کی

اجلی کینچلیوں میں صاف تھرکتی ہے
ساری کوڑھ کلنکی مایا دنیا کی

پھر جب' وقت بجھا تو ان پلکوں کے تلے
بہتے بہتے تھم گئی ندیا' دنیا کی!

جم گئے خود ہی اس دلدل میں' اور خود ہی
کریں شکایت' اہلِ دنیا' دنیا کی

دنیا کے ٹھکرائے ہوئے لوگوں کا کام
پہروں بیٹھے باتیں کرنا' دنیا کی

دلوں پہ ظالمُ یکساں' سچ کا پہرا ہے
کوئی تو جھوٹی ریت نبھا جا دنیا کی

کون ایسا ہوگا۔۔۔

کون ایسا ہوگا جو سب کے دلوں کی ٹھنڈک کا رسیا ہو'
ایسے شخص کے من میں آئی ہوئی اک بات تو وہ جھونکا ہے'
جو اک ساتھ زمانے بھر میں پھول کھلا دیتا ہے
اور۔۔۔ یہ بات کہیں باہر سے تو نہیں آتی'
یہ تو دل پر ایک گرہ ہے' جس کا کساؤ کبھی بھی کم نہیں ہوتا'
جو بھی اسے محسوس کرے' جو چوٹ سدا اس کے دل پر ہے
جب بھی کوئی اسے اپنی سانسوں میں ڈھونڈھے'
اس کی آنکھوں میں بھر جائیں وہ سیال شبیہیں'
جن کے دکھ اور جن کے جتن ان بستیوں کے گہنے ہیں
جن کی خوشیوں کے لیے جینا' ان بھیدوں میں جینا ہے' جو ازلوں سے
ان ذروں کی جنبش ہیں'

کون ایسا ہوگا جو اپنے دل کی کسک تک پہنچے'
اور پھر ایک قدم خود پیچھے ہٹ کر'
اپنی پہنچ کو اوروں کے لیے برتے' سب کے دلوں کی ٹھنڈک کے لیے
برتے'
کون ایسا ہے اس دنیا میں؟
کتنے خطرے دلوں کو دلوں سے ہیں۔۔۔سوچوں تو میرا دل دکھتا ہے!
گنگ زبانوں بولتی آنکھوں والے چہرے قدم قدم پر مجھ سے جب یہ
پوچھتے ہیں' کون ایسا ہے ''ہم کس سے پوچھیں؟''
تو میرا دل دکھتا ہے۔۔۔اور میرے سینے میں بھیدوں کا سب دھن
خاکستر ہو جاتا ہے!

دروازے کے پھول

صبح کی دھوپ ان پھولوں کا دفتر تھی، جس میں
روز ان کی اک مسکراہٹ کی حاضری لگتی،
شام کے سائے ان کی نیندوں کا آنگن تھے!

صبح کو ہم اپنے اپنے کاموں پر جاتے، تو اس سبز سڑک کے موڑ پر
تازہ دم پھولوں کے رنگ برنگے تختے ہم سے کہتے،
"کرنوں کا یہ دھن سب کا ہے، سب کا، اس میں جیو، جیو، سب مل کر!
سنگت سے ہے رنگت"
پھر جب دن کی روشنیاں تھکتیں،
تو اس موڑ پہ نیندیں اوڑھ کے سہمے ہوئے وہ پھول یہ ہم سے کہتے:

''سب کا بیری ہے یہ اندھیرا'
جلد اپنے اپنے اینٹوں سے پٹے ہوئے سپنوں میں پہنچو
اچھا' کل کو ملیں گے' کل کو کھیلیں گے!''
لیکن اب وہ تختے اجڑ گئے اور اب اس کوٹھی کے دروازے پر چکنی بجری
ہے' اور تھرکتے چمکیلے پہیے ہیں'

صاحب' تم نے تو اتنا بھی نہ دیکھا'
یہ سب پھول تو خوشیاں تھیں' محنت کش خوشیاں'
اور یہ لاکھوں کا حصہ تھیں'
تم نے تو اتنا بھی نہ سوچا'
اے رے ہم لوگوں کو راحتِ حق کی خاطر لڑنے والے وکیل جلیل!

گداگر

چلتے چلتے رک کر، جھک کر، اِدھر اُدھر بے بس بے بس نظروں سے دیکھنے والے
کبڑی پیٹھ اور پتھرائی ہوئی آنکھوں والے،
بوڑھے بھک منگے، اس اپنی حیرانی کے فریضے میں تو واقعی تو کتنا حیران
نظر آتا ہے
جانے کس کے ارادے کی رمزیں اس تیری بے بسی کی قوت ہیں
پتھریلی روحوں کے صنم کدے میں جانے کون یہ کاسہ بدست کھڑا ہے!

تجھ کو دیکھ کے میرا جی اس سے ڈرتا ہے،
تیرے ڈرے ہوئے پیکر میں جس کی بے خوفی جیتی ہے
کس دھیرج سے دھڑکتا ہوگا اس کا قلب کہ تو جس کا قالب ہے،
اتنے سکون میں اس کے جتنے قصد ہیں، میں ان سے ڈرتا ہوں

تیرے وجود کو یہ بے کل پن دے کر، کس بے دردی سے، وہ
دلوں میں سچی ہمدردی کے درد جگاتا ہے۔۔۔اور
ہم کو ترساں دیکھ کے شاید خوش ہوتا ہے!

ابھی ابھی تو، یہیں کہیں، تو میری غفلت میں تھا،
اب کہتا ہوں، مجھ کو میری آگاہی میں کب یہ بھیک ملے گی،

جاگاہوں تو۔۔۔

جاگتا ہوں تو جاگتی آنکھیں کہنے لگتی ہیں: ''یہ سب سپنے اپنے ہیں''
جیسے میں ہی تو ہوں اپنے ہر سپنے میں'
میں ہی تو ہوں اپنی جاگرتی میں'
نیندوں کے اندر بھی' نیندوں کے باہر بھی' جو جو سمے گزرتے ہیں وہ
میرے ذہن میں سب ڈھلتے ہیں
دنیا کا ہر اک دن میرے ذہن میں ڈھل کر اک اور دن ہے
جیسا آج کا دن تھا'
رات کو نیندوں میں کچھ اچھے اچھے لوگ ملے تھے' انہی چھتوں کے نیچے
جن کی دیواریں اب' کب کی' گر بھی چکی ہیں
دن کو میرے جاگنے میں کچھ اور ہی میلی میلی روحیں میرے ساتھ رہی
ہیں
روحیں' جن کی اونچی چھتوں کے نیچے میرے وجود کی دیواریں ہیں۔

کیسے کیسے نگر ہیں یہ جو تیرے روز و شب کے پھیرے میں پڑتے ہیں
کیسی کیسی اقلیمیں ہیں میرے دل کے کوٹھے کے اندر' جو ڈھے بھی چکا
ہے

آج تو جب سے جاگا ہوں' اپنی بابت اتنا کچھ سمجھ سکا ہوں'
کالی گلیوں کی دھوپ اپنے چہرے پر مل کر یہ دنیا والوں سے ملنے والا
مر بھی چکا اب' اپنی نیندوں میں جینے کی خاطر'

طغیان

میرے اپنے ظلم اور میرے اپنے کفر کے آگے، مجھ میں جو عاجزیاں ہیں
ان سے ملوث ہے میری ہستی
میں نے چاہا تھا ان عاجزیوں کی جگہ پر اک سنگین طمانیت کو اپنے سینے
میں رکھ لوں
جس میں نئی نئی کڑواہٹ کی خوشیاں ہوں
میں نے کچھ یہ مہم سر کر بھی لی تھی
لیکن چلتے چلتے ذرا سا ایک خیال آیا ہے!
پھر کالی سی اک برگشتگی میرے ذہن میں چکرائی ہے
اور میری پلکوں کی ڈوریاں ڈھلک گئی ہیں،
میرے مردہ دنوں کی کھوپڑیوں سے ظلم اور کفر کی میٹھی نظروں نے پھر
سے
میری جانب جھانکا ہے
بیتے دنوں والا یہ چہرہ ----

اس چہرے کو‘ اس چہرے کی آنکھوں کو‘ میں بھلا بھی چکا تھا‘
ان آنکھوں کو اپنے جذب اور اپنی کشش کا علم ہے‘ اور ان کے اس علم
کے آگے اب پھر میری خود آگاہی ماند ہے
اس طغیان کے آگے اب پھر عاجز ہوں
اب پھر‘ بصد خوشی اس اپنی عاجزی کے آگے بے بس ہوں
مجھ سے پوچھو‘۔۔ اپنی غرقابی کے اس احساس کی سطحیں بھی کتنی دلکش
ہیں

ننھے کی نو بیں آنکھوں ۔۔۔

ننھے کی نو بیں آنکھوں میں تارا'
اپنے اندر' ساری دنیا کے عکس' اب بھی' اسی طرح' لے کر آتا ہے'
جیسے کروڑوں برس پہلے کے بچے'
بچے انسانوں کے' بچے جانوروں کے' سب لے کر آتے تھے
اپنی آنکھ کے تل میں'

اب بھی کوئی چڑیا چشمہ نہیں لگاتی'

اب بھی' نو بیں آنکھوں والی کھلنڈری ننھی ننھی نئی نویلی نسلیں'
دیکھتے دیکھتے' دُور' ان بھرے چراہوں پر سے'

صد با پہیوں کے جنباں رخنوں کے اندر، اپنے چلتے پیڈلوں، ڈولتے

ہینڈلوں کے ساتھ

کس تیزی سے گزر جاتی ہیں،

میرا دل، میری عینک کے منقّی ہندسوں والے شیشوں کے پیچھے حیراں ہے

میں جو بمشکل بہتے ہجوموں کے ساحل پر اپنے اوسانوں کو سنبھالے ہوئے ہوں

کون اس جانب دیکھے گا

جس جانب میں ہوں

جس جانب سب نے جانا ہے!

میں کس جگ مگ میں۔۔۔

میں کس جگ مگ میں تھا اب تک۔۔۔

کہاں تھا اب تک اک یہ خیال کہ جس کی روشنی میں آج اپنی بابت سوچا

ہے' تو خود کو اک ظلمت کی منزل میں پایا ہے۔۔۔

جو بھی اچھائی ہے' مجھ تک آتے آتے میرا عیب ہے

رستے جہاں پر سب آ کر ملتے ہیں' منزل ظلمت کی ہے میں جس میں

ہوں'

میں۔۔۔ جو اپنی بے سروسامانی میں تیرے ذکر کا اہل نہیں ہوں۔۔۔

اندیشوں سے بھرا ہوا یہ سر تو کھڑکھڑاتی ہوئی مٹی کا ایک ٹھیکرا ہے' جو

تیرے قدموں پر جھک جائے تو بھی

تیری جلالت کا رتبہ نہیں بڑھتا جو پہلے ہی اوجِ مراتب پر ہے

وہ سب رستے تیرے علم میں ہیں' جو

میرے دل کی ظلمت پر آ کر ملتے ہیں'
اور جو تیری صداقت کے سرچشموں سے پھوٹے تھے'
صد ہا سمتوں سے آنے والے ان رستوں کے پیچھے
روشنیوں کے ابدؔ میں'
جن کی اوٹ میں آگے ظلمت کی منزل ہے' میں جس میں ہوں

باقی سب دنیا اب بھی اس جگ مگ میں ہے' جس سے ابھی میں
باہر آیا ہوں

جب اک بے حق۔۔۔

جب اک بے حق استحقاق کے بل پر، ۔۔۔ راحت کی اک دنیا'
جینے والی روحوں کے عفریتوں کے حصے میں آ جاتی ہے،
تو اک مشکل ابھرتی ہے: عمروں میں ان خوشیوں کا دور آتا ہے
جن کے تقدس کو زندہ رہنے والی سب اچھی قدروں نے تسلیم کیا ہے

ایسے میں اب آخر کوئی کتنا بھی سچا ہو' کیوں وہ الجھے ان لوگوں سے جن
کی اک اک سانس محافظ ان کی جھوٹی راحت کے اس قلعے کی

آخر دنیا تو یہی کہتی آئی ہے یہ راحت اک وہ حق ہے جو سب دستوروں
کا ثمر ہے
اک وہ حق جس کی خاطر ہر فرد اپنے ہونے کی میٹھی سزا چکھتا ہے
سب کچھ بھول کے اپنی ہستی کی سرمستی میں جیتا ہے

لیکن اپنے حق کے جواز کی بابت کچھ سوچے تو اس کی سوچ میں سیسہ بھر جاتا ہے
اس کی آنکھوں اور چہرے پر اک ٹھنڈی پتھریلی چمک بکھر جاتی ہے

کون اس حق سے الجھ سکتا ہے' کون اسے جھٹلا سکتا ہے
میں نے دیکھی ہے' جو کچھ اس حق سے ٹکرانے والی حجت کی سزا ہے

میں کہتا ہوں' پھر بھی دل کو چیرنے والا اپنا یہ دکھ اچھا' اس راحت سے
جس میں اس دنیا کو سہارا دینے والی غمگیں نیکیاں سب گہنا جاتی ہیں

سب کچھ جھکی جھکی ۔۔۔

سب کچھ جھکی جھکی ان جھونپڑیوں والے میرے دل کے گاؤں میں ہے، جو
میری ان پلکوں کی چھاؤں میں ہے جب یہ پلکیں میرے دل کی جانب
جھکتی ہیں

باہر: لاکھوں زندگیوں کے قبیلے،
بازو جھٹک جھٹک کر کوسنے والی نفرتیں،

باہر: مینہ برسا ہے،
باہر: چھتناروں کے دھلے دھلے پہناوے، گیلی گیلی دھرتی، اور چمکیلی
سڑکیں اور اندر میرے کمرے میں دیواریں مجھ سے کہتی ہیں،
"۔۔۔آج ہمارے پاس بھی بیٹھو۔۔۔
ہم نے ہی تو دیا تمھیں یہ دل، یہ گاؤں، کہ جو اس لمحے تمھاری ان پلکوں
کی چھاؤں میں ہے"

بندے جب تو۔۔۔

بندے، جب تو اپنی سوچ میں کوشاں ہوتا ہے اس زندگی کے لیے جس کی
خاطر، تیری روح ڈکارتی ہے تیرے دل کی دھڑکن میں:
ٹھنڈے میٹھے پانی،
سانس میں روغنی باس۔۔۔اور
اینٹوں کی عشرت میں نئی قمیصوں کی طناز کریزیں
اور اس اپنی سوچ میں کوشاں رہنے پر جب تیری آنکھیں
نئے نئے چمکیلے دکھوں سے بھر جاتی ہیں
تجھے خبر ہے، تب تو کتنا قریب آ جاتا ہے، اس دن کے
جس کی روشنیوں پر تیرے دل کے اندھیروں کا سایا ہے
اور۔۔۔اس دن کے آگے کیا ہے؟ تجھ کو بتاؤں،
تو دیکھے تو آگے تجھ کو زمانے کا وہ ان دیکھا دور دکھائی دے گا
میں نے اپنی عمر میں جس کو مرتے ہوئے دیکھا تھا!

کیا تو انہی دنوں کی زنجیروں کو پھر سے پہن لینے پر آمادہ ہے؟
کیسے کیسے، خیال مرے دل میں آتے ہیں'
لرزا دینے والے دھیان ان دنوں کے' جب لاکھوں لوگوں نے
اندھیری رات کا کالا آٹا
اپنے آنسوؤں میں گوندھا تھا'
کالے آٹے۔۔۔کالے پانی۔۔۔
نہیں، نہیں'۔۔۔۔میرا یہ بدن تو میرا بدن ہے جو اس مٹی ہی کیلئے تھا
لیکن۔۔۔میرا دل۔۔۔میرا دل تو تیرے سینے کے لیے ہے'

اے قوم

پھولوں میں سانس لے، کہ برستے بموں میں جی
اب اپنی زندگی کے مقدس غموں میں جی
وہ مائیں، جن کے لال لہو میں نہا گئے
صدیوں اب ان کے آنسوؤں اکھڑے دموں میں جی
جب تک نہ تیری فتح کی فجریں طلوع ہوں
بارود سے اٹی ہوئی ان شبنموں میں جی
ان آبناؤں سے ابھر، ان ساحلوں پہ لڑ
ان جنگلوں میں جاگ اور ان دمدموں میں جی
پیڑوں سے مورچے میں جو تجھ کو سنائی دیں
آزاد ہم صفیروں کے ان زمزموں میں جی
بندوق کو بیانِ غمِ دل کا اذن دے
اک آگ بن کے پوربوں اور پچھموں میں جی

۲۱ دسمبر ۱۹۷۱ء

رات آئی ہے، اب تو تمھارے چمکتے چہروں سے بھی ڈر لگتا ہے
اے میرے آنگن میں کھلنے والے سفید گلاب کے پھولو،
شام سے تم بھی میرے کمرے کے گلدان میں آ جاؤ۔۔۔ ورنہ راتوں کو
آسمانوں پر اڑنے والے بارودی عفریت، اس چاندنی میں، جب چمک
تمھارے چہروں کی دیکھیں گے
تو میرے ہونے پر جل جل جائیں گے اور جھپٹ جھپٹ کر
موت کے تپتے دھکتے گڑھوں سے بھر بھر دیں گے اس آنگن کو

اب تو تمھارا ہونا اک خدشہ ہے،
اب تو تمھارا ہونا۔۔۔ سب کی موت ہے
شاخ سے ٹوٹ کے میرے خود آگاہ خیالوں کے گلدان میں اب آ جاؤ
۔۔۔ اور یوں مت سہمو۔۔۔ کل پھر یہ ٹہنیاں پھوٹیں گی۔۔۔ کل پھر
سے پھوٹیں گی سب ٹہنیاں
آتی صبحوں میں پھر ہم سب مل کے کھلیں گے، اس پھلواڑی میں۔۔۔

ریڈیو پر اک قیدی۔۔۔

ریڈیو پر اک قیدی مجھ سے کہتا ہے: ''میں سلامت ہوں

سنتے ہو۔۔ میں زندہ ہوں!''

بھائی۔۔۔ تو یہ کس سے مخاطب ہے۔۔۔ ہم کب زندہ ہیں
اپنی اس چمکیلی زندگی کے لیے تیری مقدس زندگی کا یوں سودا کر کے
کب کے مر بھی چکے ہم'
ہم اس قبرستان میں ہیں۔۔۔
۔۔۔ ہم اب اپنی قبروں سے باہر بھی نہیں جھانکتے
ہم کیا جانیں' کس طرح ان پر باہر تیری دکھی پکاروں کے یہ ماتمی دیے
روشن ہیں
جن کے اجالوں میں اب دنیا ان لوحوں پہ ہمارے ناموں کو پہچان رہی ہے

۸ جنوری ۱۹۷۲ء

ان سالوں میں'
سیہ قتالوں میں
چلی ہیں جتنی تلواریں بنگالوں میں
ان کے زخم اتنے گہرے ہیں روحوں کے پاتالوں میں
صدیوں تک روئیں گی قسمتیں۔۔۔ جکڑی ہوئی جنجالوں میں
ظالم آنکھوں والے خداؤں کی ان چالوں میں
دکھوں' وبالوں میں'
قحطوں' کالوں میں'
کالی تہذیبوں کی رات آئی ہے اجالوں میں'

اور اب ان زخموں کے اندمالوں میں' اپنے اپنے خیالوں میں
چلنے لگی ہیں' کروڑوں جبڑوں تھوتھنیوں میں' زبانیں
جیبھیں جتی ہوئی بے مصرف قیلوں قالوں میں
کوئی تو میری بے زبان کے معنی ڈھونڈے ان حالوں کے حوالوں میں۔۔

جنگی قیدی کے نام

وہاں جہاں مشکلوں سے آزاد گلشنوں کی ہوائیں پہنچیں
وہیں کہیں دور ادھر تمھاری دکھوں بھری کال کوٹھری تک
ہمارے ٹوٹے ہوئے دلوں کی صدائیں پہنچیں
دعائیں پہنچیں
وفائیں پہنچیں

اس دنیا نے اب تک۔۔۔

اس دنیا نے اب تک ہم کو ہمارے جس بھی دکھاوے سے پہچانا
ہم نے اس کی پرستش کی ہے'
اور اب کی حفاظت کرتے کرتے اس کی حقیقت کو بھی کھو بیٹھے ہیں
سچ تو تھا ہی نہیں کچھ پہلے سے' اور جھوٹ کی جو اک صورت تھی وہ بھی نہ رہی اب!

اب تو دنیا سے چھپ چھپ کر ان دیسوں میں ہم پھرتے ہیں
جن میں کوئی ہمیں پہچاننے والا نہیں ہے!

-

اب تو نہ اپنے سامنے آ سکتے ہیں۔۔۔ اپنا دکھاوا ہی ہم پر ہنستا ہے۔
اور نہ غیروں ہی کے آگے اپنے اصلی روپ کو لا سکتے ہیں'
۔۔۔ خیر سے بغیر اس اپنے دکھاوے کے ہم ہیں ہی کیا۔۔۔!

اب انجانے دیسوں میں پھرتے پھرتے اپنے دکھ یاد آئے ہیں
اب ان دکھوں میں جینا' اب اس نامحرم اور مونس دھوپ میں پھرنا'
اپنے خلاف عمل کرنا ہے'۔۔۔اپنے دکھاوے کو جھٹلانا ہے

اپنے لیکھ پہ اب پچھتانا ہی اچھا جس میں سب سچی پہچانیں ہیں
اک یہ روپ ہی جس کی ذلت کی عزتیں اک جیسی ہیں ہماری نظروں
میں بھی اور غیروں کی نظروں میں بھی!

کبھی کبھی تو۔۔۔۔

کبھی کبھی تو خود اندوزی کی کیفیت میں، جب
میرا کاسۂ سر، ٹھوڑی تک، اس میرے سینے میں دھنس جاتا ہے،
اور جب میری گردن ہل بھی نہیں سکتی، اور ایسے میں، جب
اس دنیا کی بابت میرا جھوٹا سچا علم مری آنکھوں سے اس دنیا کی جانب
جھانکتا ہے۔۔تو
مجھ میں اک فوقیت کا احساس ابھرتا ہے، اور میں کس نفرت سے ان سب
لوگوں کو ٹکٹکی باندھ کے دیکھتا ہوں، جو
میرے جھوٹے سچے علم اور میری جھوٹی سچی فوقیت کا ماخذ ہیں

اوروں کے بھیدوں، اور ان بھیدوں کے عیبوں سے آگاہی، کیسی فوقیت
ہے جس میں

میرا دل اک کبریائی سے بھر جاتا ہے
اور میں اپنے آپ سے غافل ہو جاتا ہوں
اس اک آگاہی میں کیسی کیسی غفلتیں اور بے علمیاں ہیں یہ کس کو خبر ہے'
لیکن وہ جو اک کیفیت ہے' جب کاسۂ سر اس طرح سے' ٹھوڑی تک'
سینے کے خول میں دھنس جاتا ہے'
اور جب گردن ہل بھی نہیں سکتی اور آنکھیں ٹکٹکی باندھ کے
اپنے شکار کی جانب گھورتی ہیں' اک وہ کیفیت تو بندے کے خدا ہونے
کی گھڑی ہوتی ہے
ساری گراوٹیں اس جھوٹی فوقیت سے اگتی ہیں'
پھر بھی دنیا تو صرف ان لوگوں سے ڈرتی ہے نا' جن کی گراوٹیں
دوسروں کے عیبوں کو جانتی ہیں
کون مجھے پہچانے گا کہنے کو تو سب کے دلوں کے دروں خانے میں میرا
صدق گزر رکھتا ہے

ڈھلتے اندھیروں میں۔۔۔

ڈھلتے اندھیروں میں، کچی مٹی پر، کولتار کی سڑکوں پر، ہر جانب،
وہی پرانی۔۔کھدی ہوئی سی۔ لکیریں پہیوں کی اور وہی پرانی
گرد۔۔عناد۔۔اور جمگھٹ
وہی پرانی روندی ہوئی صبحیں۔۔۔۔
لیکن کہاں سے آئی ہیں یہ دل کے مساموں میں بھر جانے والی
مہکاریں ان دیکھے پھولوں کی
کانوں کے پردے بجتے نظر آتے ہیں۔۔۔تھمے ہوئے سب شور اور
دل کے پردے بجتے نظر آتے ہیں۔۔۔
ازلیں بھی ایسی ہی خوشبوؤں میں جاگی ہوں گی!

شام کی سڑکیں، وہی پرانے چہرے
سارے دن کی تھکی ہوئی یہ عبودیت، اور بے مہر نگاہوں کے آوازے ہر سو،

سب لوگ اپنے دلوں کی دھرتی پر بے مامن' سب ان راہوں پر بے
منزل' یونہی' جانے' کب سے۔۔۔

اور بستی کی دیواروں کے ساتھ ساتھ اب کتنے سکون سے نہر میں پانی
دھیرے دھیرے چمکتا چمکتا رواں ہے۔۔۔اب' جب رات کا سارا
کالا بوجھ
ان گھنے گھنے پیڑوں پر آن جھکا ہے!
دیواروں کے گھیرے میں اب یہ کیسی نیندیں سلگ اٹھی ہیں جن کے
عبیری دھوئیں میں موت اور زیست کی سرحدیں مل جاتی ہیں
ایک زمانہ ختم ہوا ہے۔۔اک دن گزرا ہے!

اور وہ لوگ

اور وہ لوگ اپنے ناموں کے حرفوں میں اب بھی زندہ ہیں جب وہ نام
ہماری زبانوں پر آتے ہیں
ہم ـ ـ ـ ـ جو اپنی بقا میں موت کا سلسلہ ہیں

ہم سے اچھے ہیں وہ لوگ،
پھول ہمارے باغوں میں جن کی قبروں کے لیے کھلتے ہیں!
ہم جو گردش کرنے والے کروں کے پاتالوں کی مٹی میں بے تذکرہ
ذرے ہیں،
ہم ہی تو ہیں وہ جیتی مرتی روحیں، جن کے ہونے اور نہ ہونے کا یہ دائرہ،
ان ناموں کی بقا کا دائرہ ہے
جن ناموں کے ذکر کی خاطر ہم بے تذکرہ ہیں!

سب کچھ دیکھ کے'
سب کچھ جانچ کے'
اب بھی لمبی بے انت آنتیں یوں دن رات اس موجِ غرور کو کشید کرنے
میں لگی ہیں جن سے
ہماری آنکھیں بھری ہوئی ہیں' اور
اب بھی ہم ان ناموں سے بے نسبت ہیں جن کی بقا کی خاطر
ہم بے تذکرہ ہیں

ساتوں آسمانوں ۔۔۔

ساتوں آسمانوں کے عکس اور کنکر آ آ کر گرتے ہیں خیالوں کے خانوں میں
یہ سب کچھ ان الگ الگ خانوں میں، اک وہ یکجا مخفی قوت ہے جو
مجھ پر ظاہر تو نہیں لیکن جو یوں ہونے میں میری ہونی کے ساتھ ہے ۔

میرے شعور کو ان کا علم نہیں ہوتا، میں پل پل، جن جن وارداتوں میں بہ جاتا ہوں
اور اپنے ہونے کی جس جس ہونی میں ہوتا ہوں ۔۔۔
اور جب کوئی مجھے یوں سنبھالتا ہے جیسے وہ میرے ساتھ ہے !

اک یہ خود آگاہ سی بے خبری جو میرے شعور کا جوہر بھی ہے
اور جو میرے شعور کے علم سے باہر بھی ہے
زندگی میں اک زندگی، آسمانوں سے آنے والی ۔۔۔ مٹی جس کی روح ہے !

تیری نیندیں۔۔۔

تیری نیندیں جانتی ہیں' ری منو۔۔۔
تیری لمبی بے کھٹکا نیندیں جانتی ہیں کیا۔۔۔
تجھ کو تھپکنے والے ٹھنڈے ہاتھوں کے پیچھے یہ کس کا دل ہے'
اور یہ جو نیندیں لانے والی کم سن صبحیں آئی ہیں'
کتنے اندھیروں کے ساتھ اب اس اک دل میں ابھری ہیں
اک دل' تجھ کو تھپکنے والے ہاتھوں کا بازو

گندمی محنت زادوں' دھانی کا جواڑوں' اور بے رزق دروں میں'
لاکھوں ہاتھ' پنگھوڑے جھلانے والے' اوران کے پیچھے' اک یہ دل'
اک دل' ان ہاتھوں کا بازو۔۔۔'

تجھ کو خبر ہے ری منو' تیری نیندوں کو دیکھ کر
آج تو یہ اک دل دنیاؤں میں جاگا ہے جو اس کی آخری دھڑکن سے
بھی ڈرے ہیں'۔

کالے سماج۔۔۔ بلکتے بچپن اور اپاہج عمریں'
آج بھی اپنی دھڑکنوں میں یہ اک دل تیرے لیے کیا کر سکتا ہے'
کل بھی وقت کا پیکر کیا کر سکے گا' یہ دل جس کا ٹوٹا ہوا بازو ہے!
کاش ایسے دن بھی آئیں جب یہ دل تیرے جاگنے میں اک شاداں
بہناپے کی مسکانوں میں جاگے

ان بے داغ۔۔۔

ان بے داغ دبیز غلافوں کے عطروں میں یوں تو سب کچھ ہے
۔۔۔۔جن کو تمہاری آنکھیں چومتی ہیں
ان شفاف چمکتی دہلیزوں میں یوں تو سب کچھ ہے
۔۔۔۔جن پہ تمہارے سجدے بچھتے ہیں
پُرہیبت دیواروں، میناروں اور گنبدوں کے سایوں میں یوں تو سب کچھ ہے
۔۔۔۔۔جن میں داخل ہوتے ہی تمہاری سانسیں
ابد کے بوجھ کے نیچے رک رک جاتی ہیں

تقدیسوں کے اسیرو، تم یہ بھی تو سوچتے،
اصل میں سب کچھ تو وہ برتاوے تھے جن کو عمروں کے اس ٹکڑے نے
اپنایا جواب ان قبروں کی مقدس مٹی ہے۔
تم بھی اس اک پل کو جگمگا سکتے ہو
جس کا تمہاری عمر اک ٹکڑا ہے
ورنہ یونہی ان اپنی سچی سوچوں میں ٹھوکریں کھاؤ گے

اب بھی آنکھیں۔۔۔

اب بھی آنکھیں ان کو ڈھونڈتی ہیں جو اب بھی آنکھوں میں بستے ہیں،

ہر جانب بستے ہیں وہ۔۔۔ ہم جن کا بھرم تھے جب وہ تھے،

اب بھی ہمارے ساتھ ہیں ان کے دکھ ہم جن کا مداوا تھے جب وہ تھے،

اب تو ان کے رابطے

ہماری زندگیوں کے غیاب میں

جینے والے کشف ہیں،

کون بتائے اپنے رازوں میں ہیں کتنی بیکراں۔۔۔ یہ بے فاصلہ دوریاں،

جانے کن اقلیموں سے آتے ہیں خیالوں کے ہلکے ہلکے سے جھکونے،

جو۔ چپکے سے دھیرے دھیرے۔ روحوں کے کنجوں میں سرسراتے ہیں،

تو آنکھوں میں بھر بھر جاتی ہے مٹی ان آستانوں کی۔۔۔

جن کے امٹ نشانوں کے سامنے

ان کے دعا کے ہاتھ ہمارے لئے اٹھے تھے!

ان کی سانسوں میں جینے والے زمانے ہمارے دلوں میں جاگتے ہیں۔۔۔ اور اب بھی ہماری آنکھوں میں بستے ہیں وہ، ہم جن کے ضمیروں میں تھے، جب وہ تھے!

اور ان خارزاروں میں ۔۔۔

اور ان خارزاروں میں چلتے چلتے خیال آتا ہے:
سدا ہمارے دلوں میں چٹکنے والی کلیوں کی یہ بہاریں'
جن صبحوں اور جن شاموں کا موسم ہیں'
وہ دن آئیں گے تو ۔۔۔'

اور کانٹوں کی ٹوٹتی نوکیں ہمارے قدموں کے نیچے کڑکڑانے لگتی ہیں'
اور سانسوں کی لہر میں لوہے کی سیال سی پتری جڑ جاتی ہے'
اور زمین کی پیٹھ پر اپنا بوجھ بہت کم رہ جاتا ہے'

اب تک ہم نے کیسے کیسے یقینوں کے ان نیلم جڑے پیالوں میں
عمروں کا زہر پیا ہے'
یوں کتنے دڑبوں میں آس کے چہروں پر اک مٹیالی سی
دمک جیتی ہے'

آسمانوں کی گونجتی پہنائی میں ہمارے نام کے ذرے بکھر بکھر جاتے

ہیں،

اور یہ سب کچھ۔۔۔

اور یہ سب کچھ ایسے وقت میں جب اپنے دامن میں پیتل کی اک

پنکھڑی بھی نہیں ہوتی!

تُو تو سب کچھ۔۔۔

تو تو سب کچھ جانتا ہے' وہ کیسی کیسی شکستہ کمر توقیریں تھیں' میں' جنکی خاطر'
تجھ سے طاغی ہو کر ڈوب رہا ہوں'
اس اک گہری ٹھنڈی سانس میں'
جس کے چلتے آرے کی یہ دھار' اب
میرے دل کو چیرنے لگی ہے'

سب کچھ والے' سب کچھ تو تجھ سے تھا'
اپنی روح کے اس خاکی سے دکھاوے کی خاطر' اک میں ہی'
جھوٹے خیالوں کی یہ کچی تیلیاں' جوڑ کے'
اپنے گمانوں کے قلعے میں یوں اب تک در بند تھا
ورنہ ساری صولتیں تو اس نام کو حاصل تھیں جو تیرے ظاہر و مخفی وجود سے باہر'
تیرا اسم ہے'
سچی عزتوں والے' ان سب کائناتوں میں جو کچھ عیاں ہے' اس سے بھی
بڑھ کر

اظہر میں تیری عطائیں، جن کے ستر میں ہیں ناموس
ان سب ناموں کے، جو سورج کے نیچے جلتے ہیں
یا جو مٹی کے اندر جیتے ہیں!
مرے بخس! نکھے ناری نام کو اپنے کرم کی رمزوں کے زمروں میں رکھنا'

غزل

اک سانس کی مدھم لو تو یہی، اک پل تو یہی، اک چھن تو یہی،
تج دو کہ برت لو دل تو یہی، چن لو کہ گنوا دو، دن تو یہی،

لرزاں ہے لہو کی خلیجوں میں، پیچاں ہے بدن کی نسیجوں میں
اک بجھتے ہوئے شعلے کا سفر، کچھ دن ہو اگر کچھ دن تو یہی،

بل کھائے، دکھے، نظروں سے رِسے، سانسوں میں بہے، سوچوں میں جلے
بجھتے ہوئے اس شعلے کے جتن!۔۔ہے کچھ بھی اگر کچھ دن تو یہی

میں ذہن پہ اپنے گہری شکن، میں صدق میں اپنے بھٹکا ہوا
ان بندھنوں میں اک انگڑائی۔۔ منزل ہے جو کوئی کٹھن تو یہی،

اس ڈھب سے جئیں، سینوں کے شرر، جھونکوں میں گھلیں، قدروں میں تلیں،
کاوش ہے کوئی مشکل، تو یہی، کوشش ہے کوئی ممکن تو یہی،

پھر برف گری، اک گزری ہوئی پت جھڑ کی بہاریں یاد آئیں
اس رت کی نچنت ہواؤں میں ہیں، کچھ ٹیسیں اتنی دکھن تو یہی!

عرشوں تک۔۔۔

عرشوں تک اونچے آدرشوں کے فیضانوں میں بھی،
اسی طرح سے، ہمیشہ، ڈرتے رہے ہیں لوگ، ان لوگوں سے، جو
اپنے لمبے بازوؤں میں سب تدبیریں رکھتے ہیں،
اور یہ کون بتائے، اس اک ڈر کے ناطے کتنے کچے ہیں، کتنے سچے ہیں،

تدبیروں والوں کی گردنیں ہل نہیں سکتیں،
لیکن ڈرے ہوئے لوگوں کی اک اک التجا کو اپنی پلکوں سے چن لیتی
ہیں وہ آنکھیں، جو ان سب موٹی موٹی گردنوں، خودسر کھوپڑیوں سے
جھانکتی ہیں، فاتح فاتح، نازاں نازاں،

اور یوں طاغی روحوں کو عظمت کی غذا ملتی ہے،
اور یوں ناتواں چیونٹیاں قدموں کے نیچے پسنے سے بچ جاتی ہیں،

اور میں نے یہ دیکھا ہے، روز، ان خشت کدوں کے اندر، اک اک
ہمہماتے چھتے ہیں،

جس میٹھے، مٹیالے، شہد کی بانٹ ہے،
اس کو نارسا عاجزیاں ان پھولوں سے حاصل کرنی ہیں، جو
فرعونوں کے باغوں میں کھلتے ہیں،

زینہ بہ زینہ، اک اک بام پہ بت اور ان کی لکھ لٹ آنکھیں ہنستی، ارذل خوشیاں بانٹتی،
روز و شب کی احتیاجوں میں۔۔۔ یوں ہی فرشوں کے دھندے چلتے ہیں،
عرشوں تک اونچے آدرشوں کے سایوں میں،

کل۔۔۔جب۔۔۔

آخر تمہیں بھی سوجھی یوں ہم ڈرے ہوؤں سے ڈرنے کی
نا بھئی، اب ہم پھر نہ کہیں گے، بات یہ جینے مرنے کی،
ابھی سنی جو تم نے کتھا یہ، موت کے مشکل لمحے کی،
وہ تو جیتے جی، خود جی سے گزرتی سوچ کی کروٹ تھی،
کاہے کو تم گھبرا گئے، یہ تو روپ تھا خود سے لگاوٹ کا
یونہی ذرا کچھ اپنے آپ سے روٹھ کے ہم نے دیکھا تھا

اچھا، مان لیا۔۔ ہیں زخم ان بھیدوں کے سب دکھن بڑے
ہونے اور نہ ہونے کے اس الجھیڑے میں کون پڑے
چھوڑیں بھی وہ جھوٹی سچی بات۔۔۔ ذرا اب دنیا کو
ایک نظر ہم اپنی شکم سیر آنکھوں سے بھی دیکھیں تو،
تمہیں خبر ہے، تم سچے ہو، دنیا کی یہ انوکھی دھج،
صرف اک سورج سے ہے وہ بھی تمہارے چہرے کا سورج

تم سچے ہو، جو کچھ بھی ہے جیتے دنوں کا میلہ ہے،
مٹی جسم ہے، مٹی نور ہے، مٹی وقت کا ریلا ہے،
ہرے بھرے میدان، ابلتے قریئے، باسمتی کی باس
سانسیں، عمریں، قدریں۔۔ سب کچھ سکے، پیسے، چربی، ماس
سب تقدیریں، سب ہنگامے، سب یہ مسائل بھنور بھنور،
سب کچھ ایک خنک سا جھونکا، تمہارے رخ کے پسینے پر!

اچھا، اب تو خوش ہو۔۔ اب بھی سنو تو میرا دل یہ کہے!
بھائی، کل کیا ہو گا۔۔۔ کل جب بیگھے خون میں بھیگ گئے

دل تو دھڑکتے ۔۔۔

دل تو دھڑکتے آگے بڑھتے قدموں کا اک سلسلہ ہے'
دل کا قدم جو گزرتے وقت کی منزل طے کرتا ہے'
ساتھ ہی' ایک ہی وقت میں' بیتے وقتوں کی جانب بھی بڑھتا ہے'
دل پر وقت کی جو منزل ہے' طے نہیں ہوتی ۔۔۔
بس اک انجانی سی آگہی ہے' جس کی بیدار مسافت پر سب مرحلے'
اک ساتھ اپنی گزرانوں کی نیندوں میں' جاگتے ہیں'

بیٹھے بیٹھے آج اس کیفیت سے ڈر اٹھا ہوں' جس کو میں پہچانتا ہوں' اور
جس کی بابت جانتا ہوں' یہ کیفیت اس وقت ابھرے گی'
آنے والے دن جب گزرے دنوں کی منزل سے گزریں گے'

گزرے ہوئے زمانوں کی منزل سے گزرنے والے ۔۔۔ آنے
والے دنوں کا خیال آتے ہی

وقتوں کی کچھ سطحیں دل کے دھڑکتے قدموں کے نیچے سے سرک گئی
ہیں'

دل کو سہارا دینے والا اک ڈر' من کو لبھانے والی ایک اداسی'
جن کا کوئی ابد ہے اور نہ عدم ہے'
پل بھر میری زیست کا حصہ رہے ہیں'
گزرے دلوں کی خوشیاں آنے والے غموں کا جزو نظر آتی ہیں'

لیکن سچ تو یہ ہے۔۔۔

لیکن سچ تو یہ ہے، صرف ہمیں جھٹلا سکتے ہیں اپنی جھوٹی سچائی کو
ورنہ اپنا حال تو یہ ہے، ظاہر کرنے کو تو یوں ظاہر کرنا جیسے ہم جیتے ہیں بس کچھ
ایسے خودمست یقینوں میں، جو
صرف ہمیں کو اپنے بارے میں حاصل ہیں۔۔۔،
لیکن اندر ہی اندر یہ باور کرنا: "آنے والی اگلی سانس تو بڑی کٹھن ہو گی،
جب تک ہم اپنے اس بہروپ کو ترک نہیں کر دیتے۔"
زندگیوں کے برتاووں میں اپنے جھوٹ سے ہم لوگوں کو دہلاتے ہیں،
اور اپنے سچ سے خود سہمے ہوئے رہتے ہیں!
ایسا کون ہے جس کی طلب دنیا میں بے بہروپ ہے،
اور خودمست آنکھوں کی ساحر ٹکٹکی اور لب بستہ حلقوموں کی مخفی تلخی
کے پیچھے تو جانے کس کس مجبوری کا عمل ہے،
کالی ریت کے جلتے صحراؤں میں شکم کی پیاس انہی خودمست آنکھوں

کے روشن روزنوں سے میٹھے چشموں کی چمک کو سونگھتی ہے!
لوگ کسی کو کتنا ہی بے فکر تفکر والا سمجھیں، پر یہ تو اس کا دل ہی
جانتا ہے، وہ میٹھے چشمے کتنے دور ہیں جو لوگوں کو اس کی آنکھوں میں
لہراتے نظر آتے ہیں،

سب سینوں میں۔۔۔

سب سینوں میں یکساں بٹے ہوئے ہیں علم اک دوسرے کے سب احوالوں کے،
اور سب سینے خالی ہیں ان دانستوں سے،
جن میں یک جانی کی نشوونما ہوتی ہے،

اپنی اپنی اناؤں کے ان بے تسنیم بہشتوں میں سب الگ تھلگ ہیں،
ان کے علموں کی ڈالی پر استفہاموں کا میوہ نہیں لگتا،

سب نے اپنی دانستوں سے ابھرنے والے سوالوں کی جانب دروازے اپنے دلوں کے مقفل کر کے چابیاں اب دوزخ کے پچھواڑے میں پھینک بھی دی ہیں۔

ایسے میں اب کون سنے گا کسی کا شکوہ،
اندر سینوں میں پہلے سے اتنا غوغا ہے اپنی ہی سانسوں کا،

راکھ کے ذروں سے زرریزے نتھارنے والے اشک آلود خیالو!
کہو تمہیں کچھ سوجھا' اپنے غبار کی اوٹ میں'

ہمیں تو پہلے ہی سے پتا تھا:
مرنے سے پہلے لوگ اپنے جاننے والوں کے علموں میں مرتے ہیں'

آنے والے ساحلوں پر۔۔۔

آنے والے ساحلوں پر تو جانے کن قدروں کی میزانیں ہیں'

لیکن ان سب بھرے جہازوں کو دیکھو' یہ قد آور مستول اور ممتلی بادبان
عرشے عرشے پر یہ بوجھل روحوں' چکنی آنکھوں والے مسافر۔۔۔
کس نخوت سے' کن اطمینانوں میں' تیرتے ہیں یہ بیڑے'۔۔
جن میں لدے ہوئے یہ خزانے آنے والے ساحلوں پر سب مٹی کے
دانے ہیں!

اور اس ڈوبنے والے کو دیکھو۔۔۔اک موج کے بل پر' آخری بار ابھر
کر'
دور سے' اس نے بادبانوں کی دھندلی قوس کو' کس حسرت سے
دیکھا۔۔
اور اسکے دل میں وہ دولت تھی' آنے والے ساحل جس کی قیمت ہیں۔۔

اوران جیتی ہانپتی سڑکوں کے پتھریلے سمندر۔۔مڑتے اورلہراتے۔۔'
اپنی منجدھاروں اور اپنے ساحلوں کو یوں روز اچھالتے ہیں میری
نظروں کے سامنے'
دنیاؤں اورعقباؤں کے اس سنگھم پر۔۔۔
اور میں خالی ہاتھوں سوچتا ہوں'۔۔۔کون ایسا ہے' جو
ان سنگین تریڑوں کے جب پار اترے تو اس کے پاس وہ سامگری ہو
آنے والے گھاٹ پہ جس کا مول ہے'

خوردبینوں پہ جھکی۔۔۔

خوردبینوں پہ جھکی آنکھوں کی ٹکٹکی کے نیچے دنیا کے چمکیلے شیشے پر اپنے لہو

کی چکٹ میں' کلبلاتے' بےکل' جرثومو!

دیکھو' تمہارے سروں پر گرداں خوردبینوں میں گھورتی آنکھیں

تقدیروں کی'

تم سے کیا کہتی ہیں۔۔۔سنو تو۔۔۔

''بھرے کرے پر جڑ جڑ جیتے کرمکو' تم کب تک سورج کی کرنوں کا میٹھا

کیچڑ چاٹو گے۔۔۔'

گیلا ریتلا سرد اندھیرا ہے آگے تو۔۔۔''

آگے تو جو کچھ ہو۔۔۔

لیکن آج تمہارے جڑے جڑے جسموں کی لپیٹوں اور تمہاری گتھم گتھا

روحوں کے گچھوں کے اندر جب میرے دبلے سے دل نے اچانک

اپنے اکیلے پن میں اپنا رخ اپنی جانب دیکھا ہے تو تم میں ہوتے

ہوئے بھی میرے دل کو تم پہ ترس آیا ہے

آگے تو جو کچھ ہو۔۔۔

دنیا کے دھبے میں بھری ہوئی ہم سب بے چہرہ بے کل روحیں، ہم سب کلبلاتے جرثومے،

آگے جو کچھ ہو۔۔۔ اک بار تو خود پہ ترس کھا کر دیکھیں۔۔۔

شاید ہم کو دیکھنے کے لیے تقدیروں کو اپنی خوردبینوں کے زاویے بدلنے پڑیں۔۔۔

اندر سے اک دموی لہر۔۔۔

اندر سے اک دموی لہر ابھر کے جب ان کے چہرے کی وریدوں میں
بھر جاتی ہے، اور جب اس امتلا میں لوگ اپنی گلابی آنکھوں کے
بے حرف تبسم سے مجھ کو اپنے دل کی اک تیکھی بات سناتے ہیں
تو میں کہتا ہوں ''مولا تو نے دیکھا میں تیری اک کیسی دنیا میں ہوں۔''

پل بھر آنکھوں کے گوشوں تک آ کے پلٹتی پتلیاں، مجھ کو اچانک سامنے پا کر،
پہلے تو دانستہ اچٹ جاتی ہیں، اور پھر دوسرے لمحے ہنستی آنکھوں کی
جھیلوں میں تیر کے مری جانب جب کچھ اتنے تپاک سے اُمڈ پڑتی ہیں،
تو میں کہتا ہوں ''مولا تو نے دیکھا میرے یہ اتنے صادق رابطے تیرے
کیسے کیسے بندوں سے ہیں''

مجھ کو دیکھے بغیر جنہیں سب علم ہے میں کس عالم میں ہوں، کچھ ایسی
آنکھیں جب میری جانب یوں تکتی ہیں، جیسے دنیا والے اک میت کو اس
کے مرے ہوئے ہونے کے وثوق میں تکتے ہیں،
باہر گیلی گیلی سڑکوں پر، سرما کے ٹھنڈے محرم جھونکوں کے ساتھ، اس
پامال سہانی دھوپ میں تھوڑی دور چلا ہوں تو اب میرا دل کہتا ہے:
''مولا تیری معرفتیں تو انسانوں کے جمگھٹ میں تھیں، میں کیوں پڑا رہا
اپنے ہی خیالوں کی اس اندھیری کٹیا میں اب تک؟''

جب صرف اپنی بابت۔۔۔

جب صرف اپنی بابت اپنے خیالوں کا اک دیا مرے من میں جلتا رہ
جاتا ہے'
جب باقی دنیا والوں کے دلوں میں جو جو اندیشے ہیں ان کے الاؤ مری
نظروں میں بجھ جاتے ہیں'
تب تو یوں لگتا ہے جیسے کچھ دیواریں ہیں جو میرے چاروں جانب اٹھ
آتی ہیں' میں جن میں زندہ چن دیا گیا ہوں'

اور پھر دوسرے لمحے' اس دیوار سے ٹیک لگا کر'۔۔ اپنے آپ کو بھول کر'
میں نے اپنی روح کے دریاؤں کو جب بھی سامنے پھیلے ہوئے خود موج
سمندر کی وسعت میں سمو دیا ہے'
میری قبر کی جامد پسلیاں اک غافل کر دینے والے سانس کی زد سے
دھڑک اٹھی ہیں!
لیکن اس اک بے بہا غفلت کو اپنانا بھی تو کتنا کٹھن ہے!
پھر دیواریں میرے گرد اٹھ آتی ہیں۔۔۔اور۔۔۔
پھر خود آگہی کا دھندلا سا مقدس دیا مری ہستی کی قبر پر ٹمٹمانے لگتا ہے!

پھر مجھ پر بوجھ۔۔۔

پھر مجھ پر بوجھ آپڑتا ہے' ان نظروں کا'
جو دنیا میں واحد نظریں ہیں جو دنیا کی ہر شے میں مجھ کو دیکھتی
ہیں۔۔۔اک مجھ کو'
اور یوں مجھ کو دیکھنے میں ان آنکھوں کے آنسو حائل نہیں ہوتے' بلکہ
پلٹ جاتے ہیں'

پھر اس بوجھ کے نیچے میری اپاہج معرفتوں کا بازو بڑھ کر مرے دل کی
کھڑکی کو کھول دیتا ہے'
جس کے کواڑوں سے پھر آ کر ٹکراتے ہیں'
باہر زور سے چلنے والی غفلتوں کی آندھی کے تیز تیز جھونکے! وہ کھڑکی
زور سے بند ہو جاتی ہے' اور پھر ان سہمی ہوئی پتھریلی مستطیلوں سے
ابل پڑتا ہے'
اجلی اجلی زندگیوں کا دریا'
جس کا پانی اتنا مہین ہے سونے کے ذرے اس میں تیرتے صاف نظر
آتے ہیں

جن میں میرے خیال بھٹک جاتے ہیں،
سر سے سارے بوجھ اتر جاتے ہیں،
بجلی کے پنکھے کی طوفانی جھنکار میں،
میرے چہرے پر ٹھنڈے جھونکے کی جھالریں بکھر جاتی ہیں،
اور پھر یہ بھی نہیں میں سوچتا: میں کس جنت میں دوزخی ہوں،

ان کو جینے کی مہلت۔۔۔

ان کو جینے کی مہلت دے، جو تیرے بندوں کی خاطر جیتے ہیں،
ورنہ۔۔۔تو۔۔۔اس نگری کا اک اک نگ کھوٹا ہے،
۔۔۔کوئی نہیں جو ناتواں ذروں کا راکھی ہو،
کون ان کا راکھی ہے، صرف ان کی یہ دو آنکھیں، جن کی نگہداری میں زندہ ہیں یہ ناتواں ذرے،
ذرے، جن میں عزتیں ٹمٹماتی ہیں اس اک گھر کی، جس پر مجوب اندیشوں کی چھت ہے،
ان آنکھوں میں جلنے والے مقدس ارمانوں کو روشن رکھ،
میں ان آنکھوں کے ارمانوں کے دکھ میں جیتا ہوں،
یہ دکھ مجھ کو زندگی سے بھی عزیز ہے،
ان کو جینے کی مہلت دے، جن کے جیتے رہنے میں اس دکھ اس غم کی عفت ہے،
ان کے دن تھوڑے ہوں تو میری زندگی ان کو دے دے
اس ہونی کے ہونے تک تو۔۔۔اپنے ہونے تک تو۔۔۔میں ہوں،
اس وقفے کو ایسی راحتوں سے بھر دے، کچھ ایسی راحتیں،
جو میں ان دو نگہدار آنکھوں کو دے سکوں، حیائیں جن کی زندگی ہیں،

جن لفظوں میں ۔۔۔

جن لفظوں میں ہمارے دلوں کی بیعتیں ہیں' کیا صرف وہ لفظ ہمارے
کچھ بھی نہ کرنے کا کفارہ بن سکتے ہیں'

کیا کچھ چیختے معنوں والی سطریں سہارا بن سکتی ہیں' ان کا
جن کی آنکھوں میں اس دیس کی حدان ویراں صحنوں تک ہے'

کیسے یہ شعر اور کیا ان کی حقیقت؟
ناصاحب' اس اپنے لفظوں بھرے کنستر سے چلو بھر کر بھیک کسی کو دے کر'
ہم سے اپنے قرض نہیں اتریں گے'
اور یہ قرض اب تک کس سے اور کب اترے ہیں'

غزل

اور اب یہ کہتا ہوں، یہ جرم تو روا رکھتا
میں عمر اپنے لیے بھی تو کچھ بچا رکھتا

خیال صبحوں، کرن ساحلوں کی اوٹ سدا
میں موتیوں جڑی بنسی کی لے جگا رکھتا

جب آسماں پہ خداؤں کے لفظ ٹکراتے
میں اپنی سوچ کی بے حرف لو جلا رکھتا

ہوا کے سایوں میں، ہجر اور ہجرتوں کے وہ خواب
میں اپنے دل میں وہ سب منزلیں سجا رکھتا

انہی حدوں تک ابھرتی، یہ لہر جس میں ہوں میں
اگر میں سب یہ سمندر بھی وقت کا رکھتا

پلٹ پڑا ہوں، شعاعوں کے چیتھڑے اوڑھے
نشیبِ زینۂ ایام پر عصا رکھتا

یہ کون ہے جو مری زندگی میں آ آ کر۔۔۔
ہے مجھ میں کھوئے مرے جی کو ڈھونڈتا' رکھتا

غموں کے سبز تبسم سے کنج مہکے ہیں'
سمے کے سم کے ثمر ہیں' میں اور کیا رکھتا

کسی خیال میں ہوں یا کسی خلا میں ہوں
کہاں ہوں' کوئی جہاں تو مرا پتا رکھتا

جو شکوہ اب ہے یہی ابتدا میں تھا' امجدؔ
کریم تھا' مری کوشش میں انتہا رکھتا

صبح ہوئی ہے۔۔۔

صبح ہوئی ہے، صبح جو نیندوں میں جینے والی اک موت سے جاگ اٹھنے کی انگڑائی ہے،
سونے والو، تمہاری خاک آلودہ لمبی نیندیں، میری اک اک شب کی نیند کی ہمیشگیاں ہیں،

سونے والو، جیسی تمہارے وقتوں میں تھی، اب بھی اسی طرح سے ہے یہ دنیا،
صبحیں۔۔۔ اور ان کے بعد آتی شاموں کے کالے جھونکے، جن سے دامن میں موت ہے نیندوں میں ابدائی ہوئی،

اور گلی کی ٹوٹی سلاخوں والی نالی تک آ کر، جب اک بوڑھے نے،
اپنے کھوکھلے پوپلے سے جبڑے کو عصا کے خم پر رکھ کے جنازہ برداروں سے پوچھا:
''کون تھا؟''۔۔۔ تو گدرایا ہوا اک ماتمی بولا:
''کوئی مہلت مند تھا، ہم تو کاندھا دینے چل پڑے اس کے ساتھ کہ وہ

سو برس جیا تھا۔"

اور اک بے آب آنسو کی سسکی، جب

بھرے محلّے کے دروازوں منڈیروں سے گزری تو موت کی لذت سے

سب چہرے تمتما اٹھے،

یہ سب اپنے خواب ہیں، سونے والو،

خواب ہمارے جن میں تمہاری دنیا جاگتی ہے، اے سونے والو!

ہر روز، ان صبحوں میں، اک اک شب کی موت کے ڈھلنے پر، اک ان

دیکھے طائر کے گیت ہیں،

مرنے والوں کے یہ بول ابھرے ہیں: "جیو۔۔ جیو رے۔۔ جیو جیو رے!"

سونے والو، تمہیں خبر ہے،

اپنی ان نیندوں سے جاگ کے، جب میں تمہارے دھیان میں جیتا

ہوں، تو

تمہاری نیندوں میں کفنائے ہوئے ارمان

مرے جینے میں جاگتے ہیں،

میرے دل میں۔۔۔

میرے دل میں غم کے دشنے کی دھار اتری ہے'
دل کا اک ٹکڑا دل سے کٹ کر گرنے کو ہے'
ایسے میں اک مونس سچائی ہنستی ہوئی میرے سامنے آتی ہے'
اور میں اک ہاتھ سے اپنے دل کے گرتے ہوئے ٹکڑے کو دل پر جوڑ کے' کس کے'
گہرے کرب کی لذت میں مسکا کر'
دوسرے ہاتھ سے اس کو بڑھ کے سلام کرتا ہوں'
پھر میں دیکھتا ہوں' دنیا والوں کی ملاقاتوں میں ہمیشہ'
ہر سچائی کا اک ہاتھ تو صرف مصافحہ ہوتا ہے'
اور دوسرا ہاتھ اتنی ہی مضبوطی سے اپنے دل کی گرتی ہوئی اک پھانک کو دل کے ساتھ دبائے ہوئے ہوتا ہے'

سچی بات جو دل کو لبھاتی ہے' اک دل سے دوسرے دل تک' کس مشکل سے سفر کرتی ہے'
اتنی برکتوں والے مکر کی بھی کیا بات ہے'

غزل

بچا کے رکھا ہے جس کو غروبِ جاں کے لئے
یہ ایک صبح تو ہے سیرِ بوستاں کے لئے

چلیں کہیں تو یہ دل زمانوں میں ہوں گی
فراغتیں بھی اس اک صدقِ رائیگاں کے لئے

لکھے ہیں لوحوں پہ جو مردہ لفظ' ان میں جئیں
اس اپنی زیست کے اسرار کے بیاں کے لئے

پکارتی رہی بنسی' بھٹک گئے ریوڑ'
نئے گیاہ' نئے چشمۂ رواں کے لئے

سحر کو نکلا ہوں' مینہ میں' اکیلا۔۔ کس کے لئے؟
درخت' ابر' ہوا۔۔۔ بوئے ہمرہاں کے لئے

سوادِ نور سے دیکھیں تو تب سراغ ملے
کہ کس مقام کی ظلمت ہے کس جہاں کے لئے

تو روشنی کے ملیدے میں رزق کی خاطر
میں روشنائی کے گودے میں آب و ناں کے لئے

ترس رہے ہیں سدا خشت لمحوں کے دیس
جو میرے دل میں ہے اس شہرِ بے مکاں کے لئے

یہ نین۔۔ جلتی لووں جیتی نیکیوں والے
گھنے بہشتوں کا سایہ ہیں ارضِ جاں کے لئے

ضمیرِ خاک میں خفتہ ہے میرا دل، امجدؔ
کہ نیند مجھ کو ملی خوابِ رفتگاں کے لئے

ہر جانب ہیں۔۔۔

ہر جانب ہیں دلوں ضمیروں میں کالے طوفانوں والے لفظ۔ ہزاروں
گھنی بھوؤں کے نیچے۔۔۔گھات میں'
اب تو میرے لبوں تک آ بھی' حرفِ زندہ'
ہر جانب گلیوں کے دلدلی تالابوں میں' بے ستر' ہراساں' کھڑی ہیں روحیں'
قدم کھبے ہیں نیلے کیچڑ میں' اور ان کی ڈوبتی نظروں میں اک بار ذرا
تیری تھی ان کی زندگی' ابھی ابھی' اک پل کو'
اور اب پھر کالے طوفانوں والے لفظ ان کے لیے جانے کیا کیا
سندیسے لائے ہیں'
ان کو زندہ رکھیو' حرفِ زندہ!
مدتوں سے بے یاد ہے تو میرے نسیانوں میں' اے حرفِ زندہ'
اب تو میرے لبوں پر آ بھی'
اب۔۔ جب میرے دیکھتے دیکھتے کالے طوفانوں والے لفظوں کا آبی
فرش اک
بچھ بچھ گیا ہے' دور' افق کے پیچھے' کہیں' ان پانیوں تک' جن پر اک ناخدا
پیغمبر کی دعاؤں کے بجرے تیرے تھے!

غزل

بنے یہ زہر ہی وجۂ شفا' جو تو چاہے
خرید لوں میں یہ نقلی دوا' جو چاہے

یہ زرد پنکھڑیاں' جن پر کہ حرف حرف ہوں میں
ہوائے شام میں مہکیں ذرا' جو تو چاہے

تجھے تو علم ہے کیوں میں نے اس طرح چاہا
جو تو نے یوں نہیں چاہا' تو کیا' جو تو چاہے

جب ایک سانس گھسے' ساتھ ایک نوٹ پسے
نظامِ زر کی حسیں آسیا' جو تو چاہے

بس اک تری ہی شکم سیر روح ہے آزاد
اب اے اسیرِ کمند ہوا' جو تو چاہے

ذرا شکوہِ دو عالم کے گنبدوں میں لرز
پھر اس کے بعد ترا فیصلہ' جو تو چاہے

سلام ان پہ تہِ تیغ بھی جنہوں نے کہا
تو تیرا حکم' جو تیری رضا' جو تو چاہے

جو تیرے باغ میں مزدوریاں کریں' امجد
کھلیں وہ پھول بھی اک مرتبہ' جو تو چاہے

غزل

ہر وقت فکرِ مرگِ غریبانہ چاہیے
صحت کا ایک پہلو مریضانہ چاہیے

دنیائے بے طریق میں جس سمت بھی چلو
رستے میں اک سلامِ رفیقانہ چاہیے

آنکھوں میں امڈے روح کی نزدیکیوں کیساتھ
ایسا بھی ایک دور کا یارانہ چاہیے

اب دردِ شش بھی سانس کی کوشش میں ہے شریک
اب کیا ہو، اب تو نیند کو آ جانا چاہیے

روشن ترائیوں سے اترتی ہوا میں، آج
دو چار گام لغزشِ مستانہ چاہیے

امجد، ان اشکبار زمانوں کے واسطے
اک ساعتِ بہار کا نذرانہ چاہیے

غزل

صبحوں کی وادیوں میں گلوں کے پڑاؤ تھے
دور۔۔ایک بانسری پہ یہ دھن: "پھر کب آؤ گے؟"

اک بات رہ گئی کہ جو دل میں نہ لب پہ تھی
اس اک سخن کے، وقت کے سینے پہ، گھاؤ تھے

کھلتی کلی کھلی کسی تاکید سے نہیں،
ان سے وہ ربط ہے جو الگ ہے لگاؤ سے

عیب اپنی خوبیوں کے چنے اپنے غیب میں
جب کھنکھنائے قہقہوں میں، من گھناؤنے

کاغذ کے پانیوں سے جو ابھرے تو دور تک
پتھر کی ایک لہر پہ تختے تھے، ناؤ کے!

کیا روتھی، جو نشیب افق سے مری طرف
تیری، پلٹ پلٹ کے، ندی کے بہاؤ سے

امجد، جہاں بھی ہوں میں، سب اس کے دیار ہیں
کنجن سہاؤنے ہوں کہ جھنگڑ ڈراؤنے

غزل

چمن تو ہیں نئی صبحوں کے دائی، پھر بھی،
ہے میرے ساتھ تو اب ختمِ قرنِ آخر بھی،
مری ہی عمر تھی جو میں نے رائیگاں سمجھی
کسی کے پاس نہ تھا ایک سانس وافر بھی،
خود اپنے غیب میں بن باس بھی ملا مجھ کو،
میں اس جہان کے ہر سانحے میں حاضر بھی،
ہیں یہ کھنچاؤ جو چہروں پہ آب و ناں کے لیے
انہی کا حصہ ہے میرا سکونِ خاطر بھی،
میں اس جواز میں نادم بھی اپنے صدق پہ ہوں
میں اس گنہ میں ہوں اپنی خطا سے منکر بھی،
یہ کس کے اذن سے ہیں اور یہ کیا زمانے ہیں
جو زندگی میں مرے ساتھ ہیں مسافر بھی،
ہیں تیری گھات میں امجدؔ جو آسمانوں کے ذہن
ذرا بہ پاسِ وفا ان کے دام میں گر بھی،

آٹوگراف

کھلاڑیوں کے خودنوشت دستخط کے واسطے
کتابچے لیے ہوئے
کھڑی ہیں منتظر............ حسین لڑکیاں!
ڈھلکتے آنچلوں سے بے خبر، حسین لڑکیاں!

مہیب پھاٹکوں کے ڈولتے کواڑ چیخ اٹھے
اُبل پڑے الجھتے بازوؤں، چٹختی پسلیوں کے پر ہراس قافلے
گرے، بڑھے، مڑے بھنور ہجوم کے

کھڑی ہیں یہ بھی، راستے پہ، اک طرف،
بیاضِ آرزو بہ کف
نظر نظر میں نارسا پرستشوں کی داستاں
لرز رہا ہے دم بہ دم
کمانِ ابرواں کا خم
کوئی جب ایک نازِ بے نیاز سے
کتابچوں پہ کھینچتا چلا گیا
حروفِ کج تراش کی لکیرسی
تو تھم گئیں لبوں پہ مسکراہٹیں شریرسی

کسی عظیم شخصیت کی تمکنت
حنائی انگلیوں میں کانپتے ورق پہ جھک گئی
تو زرنگار پلوؤں سے جھانکتی کلائیوں کی تیز نبض رُک گئی!

وہ باؤلر ایک مہ وشوں کے جمگھٹوں میں گھر گیا
وہ صفحۂ بیاض پر بصد غرور کلکِ گوہریں پھری
حسین کھلکھلاہٹوں کے درمیاں وکٹ گری

میں اجنبی، میں بے نشاں
میں پابہ گِل!
نہ رفعتِ مقام ہے، نہ شہرتِ دوام ہے
یہ لوحِ دل! یہ لوحِ دل!
نہ اس پہ کوئی نقش ہے، نہ اس پہ کوئی نام ہے!